صفر المظفر۔ ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ
اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۰ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

موسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات:360، قیمت 500 روپے

حصہ دوم سورۃ آل عمران تا سورۃ المائدہ
صفحات 326، قیمت 500 روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 500 روپے

حصہ چہارم سورۃ یونس تا سورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 550 روپے

حصہ پنجم سورۃ مریم تا سورۃ السجدۃ
صفحات 480، قیمت 750 روپے

حصہ ششم سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات
صفحات 484، قیمت 750 روپے

حصہ ہفتم سورۃ قٓ تا سورۃ الناس
صفحات 560، قیمت 800 روپے

(مکمل سیٹ: 4300 روپے)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۲۹ — شمارہ ۴

صفر المظفّر۔ ربیع الثّانی ۱۴۴۲ھ — اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۰ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہما اللہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 280 روپے، فی شمارہ: 70 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

تشکیلِ اُمّت کا قرآنی بیانیہ اور بعض اہم تنبیہات	حافظ عاطف وحید	3

مقامِ مصطفٰی ﷺ

در جہانی واز جہاں بیشی	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	10

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۲۳)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	21

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	31

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ	مومن محمود	41

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	70

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تشکیلِ اُمّت کا قرآنی بیانیہ اور بعض اہم تنبیہات

حافظ عاطف وحید

ہماری ایک تحریر حکمتِ قرآن (جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء) کے اداریے میں ''انبیاء ورُسل علیہم السلام کا مقصدِ بعثت اور تشکیلِ اُمت کا قرآنی بیانیہ'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے' جس میں قرآنی تعلیمات اور احادیثِ نبویہ کی روشنی میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ نصوص میں انبیاء ورسلؑ اور بالخصوص محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے متعدد مقاصد اور فرائض ہائے منصبی بیان کیے گئے ہیں جن میں تلاوتِ آیاتِ الٰہیہ' تعلیم وتفسیرِ کتاب وشریعت' حکمت واحکام دین کی تعلیم وتبیین' اس پر ایمان لانے والوں کا ظاہری و باطنی تزکیہ وتطہیر' تعلیم وتربیتِ اخلاقِ حسنہ' حرمِ مقدّس کو شرک وکفر اور بدعات کی ہر آلائش سے پاک کر کے اسے توحید وہدایت کا مرکز بنانا اور یہاں اللہ ربّ العزّت کے آئین اور قانون کو بالادست اور غالب قانون کی حیثیت سے منوانا' ظلم وتعدّی کے ضابطوں کا قلع قمع کرنا' مزاحم قوتوں کو علمی وعسکری شکست سے دوچار کرنا' ایسی اُمّت تشکیل دینا جو انسانیت کے جوہر شرافت وفضیلت سے آراستہ ہو اور علم' روحانیت واخلاق کے درجۂ کمال پر فائض ہو۔ اس اُمّت کے ایمان اور اخلاص کی خود گواہی دینا اور اس میں خلق کی ہدایت اور فریضہ شہادت علی النّاس کی ادائیگی کی اہلیت اور احقیّت کا شعور اور احساس پیدا کرنا۔ یہ تمام مقاصد اور فرائض منصوص ہیں اور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت واکملیت پر دلیل بھی ہیں۔ ان مقاصد میں باہمی ربط بھی ہے اور ایک فطری تدریج بھی۔ ان میں سے کسی مقصد کو کم اہم' غیر ضروری یا غیر متعلق نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سب ہی خارجی اور معروضی حالات کے اعتبار سے اُمّتیوں کے اخلاصِ دین اور عزم واستقلال کے لیے میدان ہائے عمل ہیں۔

سیرت النّبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطالعے سے اس اَمر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ عوام النّاس میں دین کا شعور اور اس کے مطالبات پر چلنے کی خواہش پیدا کیے بغیر دین کے سیاسی غلبے کی کوشش اس لیے بے معنی بات ہے کہ جو چیز سماجی طور پر مقبول نہ ہو سکے وہ قانونی طور پر کیونکر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے ''وحدتِ اُمّت'' نامی کتابچہ (شائع کردہ مکتبہ خدام القرآن لاہور' ۲۰۰۸ء) میں یہ واضح کیا ہے کہ آج کے دور میں ہماری دینی جماعتیں' جو چاہے تعلیمِ دین یا ارشاد وتلقین کے کام میں مشغول ہیں یا دعوت وتبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے قائم کی گئی ہیں یا غلبہ واقامتِ دین کی اعلانیہ جِدّ وجُہد کی خاطر ظہور پذیر ہوئی ہیں' وہ سب اپنی دانست میں مفید خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور ان میں ایک بڑی تعداد میں اہلِ علم اور مخلصین کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسا

فارمولا وضع کیا جا سکے کہ ہر جماعت دوسری کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور کارِ رسالت کی ادائیگی میں باہم ایک دوسرے کو اپنا دست و بازو سمجھیں تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام اور منہج میں جُدا رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس صورتحال یہ ہے کہ عموماً ہر جماعت گروہ بندی کے گوناگوں گرداب میں پھنس کر باہم دگر متفرق اور منتشر نظر آ رہی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سعی و عمل کا جو دائرہ کار اور نظامِ عمل ہر جماعت نے بنا رکھا ہے عملی طور پر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ خدمتِ دین کو اسی میں منحصر اور موقوف سمجھ رہے ہیں۔ دوسری جماعتوں سے اگر ظاہری جنگ و جدل نہیں بھی ہے تب بھی انہیں تحقیر اور بے قدری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارا تاثر ہے کہ یہ مرض جماعتوں کے اکابرین میں زیادہ شدّت سے پیدا ہوتا ہے کہ اس کیفیت میں انہیں اپنے وجود و بقا کی حفاظت کا ممکنہ سامان نظر آتا ہے۔ درآنحالیکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنا بنایا ہوا نظام العمل اور اس کے تنظیمی و دستوری ڈھانچے ایسے منصوص و متفق علیہ نہیں ہوتے کہ ان کا اتباع ہر ایک کے لیے لازم ہو' اسی لیے ہر جماعت کے مفکرین نے خارجی حالات کے تجزیے اور دورِ حاضر میں مقصد کے حصول کی ممکنہ راہوں میں سے اپنی دانست میں زیادہ قرین امکان لائحہ عمل کو اختیار کر رکھا ہوتا ہے اور ان میں حسبِ ضرورت تغیّر و تبدیلی وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں۔ حالات اور ماحول بدلنے پر اپنا منہج بدل لینا کسی کے نزدیک بھی ناجائز یا مکروہ نہیں ہے۔ لیکن اپنے اپنے حالیہ منہج بارے علمی قطعیت و حتمیت کا زعم اور اس میں غلو جماعتوں میں اس قدر پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظامِ عمل کو مقصدِ منصوص کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ جو شخص فکری اعتبار سے یا عملی پہلو سے خواہ کتنا ہی عظیم کام کر رہا ہو اُسے اپنا بھائی اور شریکِ کار نہیں سمجھا جاتا۔ اور اگر کوئی ایک شخص جماعت میں شریک تھا' پھر کسی اختلاف یا ذمہ داران کے رویّوں کی بنا پر شریکِ کار نہ رہے تو عملاً اسے اصل مقصد بلکہ دین سے ہی منحرف سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ چاہے وہ اصل مقصد یعنی حکم و اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے۔ اس غلو کے نتیجے میں وہی تفرق پیدا ہو جاتا ہے جو جاہلی عصبیتوں میں مبتلا لوگوں میں پایا جاتا تھا۔

عمومی مشاہدہ ہے کہ حکم و اقامتِ دین میں مشغول عناصر کا اجتہادی و ذوقی اختلافات کی بنا پر باہمی تشتّت و افتراق عام مسلکی تفرقے سے بھی زیادہ خطرناک شے ہے۔ اس لیے کہ مسلکی و فقہی تفرقہ اگر علم و عرفان کے جمود پر منتج ہوتا ہے تو فکری و نظریاتی تفرق شدید نوع کے زوالِ اخلاق کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے جن لوگوں کو اپنی اعلیٰ فکری قطعیت و حجیت کا بخار چڑھا ہوا ہو وہ مزاجی سختی' نخوت اور بڑائی کے روگ میں عام لوگوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جماعتوں کے افراد کی سرِ عام تحلیلِ نفسی' بہتان طرازی اور دلائل کی ہیرا پھیری میں انہیں عار اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ یہ سب حکم و اقامتِ دین کے اعلیٰ مقصد سے کر رہے ہوتے ہیں۔ اس مشترک رجحان کی خطرناکی کا عالم یہ ہے کہ اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور ممنوع اور مذموم تفرق (اس کی وضاحت آگے کی سطروں میں ملاحظہ کیجئے) کے نتائج میں سرِ مُو فرق نہیں۔ اس لیے کہ دونوں ہی گروہ بندیوں' تفسیق' تضلیل حتیٰ کہ تکفیر تک میں

مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس ضمن میں احتیاطی طور پر ادا کیے ہوئے نعرے اور دعوے بے اثر ہی رہتے ہیں۔

تفرق و گروہ بندی کی اقسام اور اسباب کے حوالے سے دینی لٹریچر میں مفید مواد موجود ہے۔ مثلاً ''احکام القرآن'' کے مؤلف قاضی ابوبکر ابن العربیؒ نے تفرقِ ممنوع اور اختلافِ ممنوع کو خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ نیز مولانا مودودیؒ نے بھی اپنی کتاب ''شہادتِ حق'' میں اس موضوع پر علمی بحث کی ہے۔ ذیل میں ان توضیحات کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے:

قاضی ابن العربیؒ کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک قسم وہ اختلاف اور تفرق ہے جو حسد و عناد اور قبائلی و علاقائی یا گروہی عصبیت پر مبنی ہو اور کسی علمی تحقیق اور دلیل یا مذہبی عقیدے پر مبنی نہ ہو۔ اس کی ممانعت سورہ آلِ عمران کی آیات ۱۹، ۲۰ اور اس مفہوم کی دوسری آیات و احادیث میں آئی ہے اور یہ ایک خطرناک تفرق ہے۔

دوسری قسم اسلام کے بنیادی عقائد سے جان بوجھ کر انکار کرنا، اختلاف کرنا اور پھوٹ ڈالنا۔ یہ اختلاف و انکار چونکہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں کیا جاتا بلکہ جان بوجھ کر کیا جاتا ہے، اس لیے اس کی اصل وجہ بھی حسد و عناد اور خودسری و سرکشی ہوتی ہے۔ اس نوع کے تفرق کا ذکر سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ اور ۱۴ میں ہوا ہے۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاء اور ان کی اُمتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کو قائم کرو اور قائم رکھو اور اس دین میں تفرقہ اور اختلاف نہ ڈالو۔ یعنی سب مل کر اس پر ایمان لاؤ، اس پر عمل کرو، اس کو قائم کرو اور اگر قائم ہے تو قائم رکھو۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جس دین کی دعوت تم دیتے ہو وہ مشرکین پر بھاری اور ناگوار ہے، لیکن جو لوگ حق کی طرف رجوع کرنے والے ہوتے ہیں اور حق و صداقت کے متلاشی ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ چُن کر اس دین کے پاس لے آئے گا اور وہ ایمان لے آئیں گے اور اقامتِ دین کے لیے جِدّوجُہد شروع کر دیں گے۔ پھر اختلاف و انکار کی اصل وجہ پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ''اور تفرقہ اور اختلاف نہیں ڈالا انہوں نے مگر ان کے پاس علم آجانے کے بعد ڈالا ہے، آپس کی ضد کی وجہ سے''۔ یعنی توحید پر مبنی دین اسلام سے اختلاف کرنے والوں کا یہ اختلاف غلط فہمی اور لاعلمی پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس اختلاف و انکار کا باعث اور اصل وجہ صرف نفسانیت، عداوت اور بغاوت ہے۔ اس قسم کے تفرق کا ذکر سورۃ آل عمران میں اس طرح بھی ہوا ہے کہ ''اور تم ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے پھوٹ ڈالی اور اختلاف کیا، باوجود اس کے کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آ گئی تھیں، اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

تیسری قسم تفرق کی یہ ہے کہ فروعی اور اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے سے براءت اور قطع تعلق کیا جائے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ایک دوسرے کی تفسیق و تضلیل کی جائے۔ یہ بھی ممنوع ہے۔ اس لیے کہ آراء کا یہ اختلاف قرآن و سُنّت کی تعبیر میں ہے اور تعبیر و اجتہاد کا اختلافِ اُمّت کی وحدت کے منافی نہیں ہے۔ تو جو شخص اور گروہ اس نوع کے اجتہادی اور تعبیر کے اختلاف کو گروہ بندی کا ذریعہ بناتا ہے اور مخالف رائے رکھنے والوں سے براءت اور قطع تعلق کرتا ہے وہ یہودیوں کی سُنّت پر چلتا ہے اور اسی لیے قابلِ مذمّت ہے۔

مولانا مودودیؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ دین میں جن باتوں کی وجہ سے تفرقہ برپا ہوتا ہے ان سب کا اگر آپ اِستقصاء کریں گے تو وہ مندرجہ ذیل عنوانات پر منقسم کی جا سکیں گی:

ایک یہ کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کیا جائے جو دین میں نہ ہو اور اسی کو اختلافِ کُفر و ایمان یا فرقِ ہدایت و

ضلالت کی بنیاد بنا ڈالا جائے۔

دوسرے یہ کہ دین کے کسی خاص مسئلے کو لے کر اس کو وہ اہمیت دی جائے جو کتاب وسنّت کی رُو سے اُس کو حاصل نہیں ہے اور اسی کو تنظیم سازی و گروہ بندی کی بنا قرار دے لیا جائے۔

تیسرے یہ کہ اجتہادی اور استنباطی مسائل میں غلو کیا جائے اور ان امور میں اپنے مقتدا اور اس کے مسلک کے سوا دوسرے مسلک والوں کی تفسیق وتضلیل یا تکفیر کی جائے' یا کم از کم گروہی اعتبار سے اُن سے امتیازی سلوک کیا جائے۔

چوتھے یہ کہ (نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد) کسی خاص شخصیت کے معاملہ میں غلو کیا جائے اور اُس کے لیے کوئی ایسا کا دعویٰ کیا جائے جسے تسلیم کرنے یا نہ کرنے پر حق و باطل کا مدار ہو۔

پانچویں یہ کہ آج کوئی گروہ یہ دعویٰ کرے کہ جو گروہ اس میں داخل ہے صرف وہی حق پر ہے' باقی مسلمان گمراہی پر ہیں۔

اس فہرست میں چھٹا نکتہ یہ بھی شامل کر لیا جائے تو بات مکمل ہو جائے گی کہ مقتدا (ائمہ و مجتہدین) اور ان کے متبعین (یعنی مقتدیوں) کے درمیان حدِ اعتدال سے متجاوز عقیدت بھی تفرقے کا باعث بنتی ہے۔ اکثر ائمہ و مقتدا تو اپنے اخلاص کی وجہ سے حق کے سامنے جھکنے میں عار محسوس نہیں کرتے لیکن ان کی وفات کے بعد مقتدی انہیں ہی معیارِ حق بنا کر اپنے حق میں بھی اور دوسروں کے لیے بھی آزمائش اور فتنے کا موجب ہو جاتے ہیں۔

اس موضوع پر داعیٔ قرآن' بانیٔ تنظیم اسلامی اور صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے سورۃ العنکبوت کی آیت ۲۵ کے ذیل میں جو کچھ فرمایا ہے وہ چشم کشا ہی نہیں' لرزہ خیز بھی ہے۔ اندھی بہری عصبیت کیسے تفرقِ ممنوع کا باعث بنتی ہے' ذیل کے اقتباس سے اس نکتے کی وضاحت ہوتی ہے:

''یہ بہت اہم بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ میں تمہیں متنبہ کر چکا ہوں کہ تم لوگ جن بُتوں کو پوجتے ہو ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے اور ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ میرے سمجھانے پر تم لوگ یہ بات سمجھ بھی چکے ہو' اس سلسلے میں حق تم لوگوں پر پوری طرح منکشف بھی ہو چکا ہے اور تمہارے دل اس بارے میں حق کی گواہی بھی دے چکے ہیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود بھی تم لوگ اگر بُتوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو اور گمراہی کا راستہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو' تو اس کی اصل وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم لوگ آپس کے تعلقات' آپس کی دوستیاں اور رشتہ داریاں نبھا رہے ہو۔ دراصل یہ وہ بنیادی عامل (factor) ہے جو ہر سطح پر لوگوں کے لیے حق کو قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ ایک معقول اور باشعور شخص کی تان بھی اکثر یہیں پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ جی ہاں بات تو درست ہے' دل کو بھی لگتی ہے مگر کیا کریں مجبوری ہے! دوسری طرف برادری ہے' رشتہ داریاں ہیں' دوستیاں ہیں اور کاروبار کی شراکت داریاں ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے چھوڑ دیں؟ سب سے ناتا کیسے توڑ لیں؟ زندہ رہنے کے لیے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ انسان بھلا اکیلا کیسے زندگی گزار سکتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

یہ عصبیت ہر جگہ اور ہر دور میں اپنا رنگ دکھاتی ہے' حتیٰ کہ خالص دینی بنیادوں پر اٹھنے والی تحریکیں بھی اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سب کچھ یکدم نہیں ہو جاتا بلکہ منفی عصبیت کے خطرناک جراثیم

آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے کسی تحریک کی صفوں میں داخل ہوتے ہیں۔فرض کریں کہ آغاز میں ایک تحریک کا نظریہ بالکل خلوص پر مبنی تھا۔ اس کے کارکنوں کی وابستگی بھی خالصتاً حق شناسی کی بنیاد پر تھی اور ان میں جدّوجُہد کا جذبہ بھی قابل رشک تھا' مگر پھر کسی موڑ پر کہیں کوئی غلطی ہوئی اور تحریک کسی غلط رخ پر مڑ گئی۔ عموماً ایسی غلطیوں کے نتائج فوری طور پر سامنے نہیں آتے' بلکہ کچھ عرصے تک تو کارکنوں کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ان کی تحریک غلط موڑ مڑ چکی ہے۔لیکن جب اس غلطی کے نتائج واضح طور پر سامنے آنے لگتے ہیں اور کارکنوں کو معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو اس کے باوجود بھی ان کی اکثریت اس تحریک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ایسی صورت حال میں وہ لوگ محض ''عصبیت'' کی وجہ سے اس تحریک کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔غور سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ کسی بھی جماعت یا تنظیم کے اندر' خواہ وہ خالص دینی بنیادوں پر ہی کیوں نہ اٹھی ہو' کچھ دیر کے بعد شخصی تعلقات' باہمی رشتہ داریاں اور مشترکہ مادی مفادات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔گویا ''جماعتی عصبیت'' کے علاوہ چھوٹی چھوٹی دوسری عصبیتیں بھی اس کے حلقے کے اندر فعال ہو جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ہر ایسی جماعت ایک فرقہ بن جاتی ہے۔

اس نکتے کو اس پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ اب نبوت ختم ہو گئی ہے اور قیامت تک دنیا میں کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے زمانے تک اس خلا کو پُر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تین چیزوں کا اہتمام فرمایا ہے:

(۱) قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری کا اہتمام۔جبکہ اس سے پہلے کسی کتاب کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی گئی۔[۱]

(۲) ہر صدی میں ایک مجدّد اٹھانے کا اہتمام۔ یہ مجدّد دین کے بنیادی حقائق کو تازہ کیا کرے گا اور لوگوں کو دین کی ان حقیقی تعلیمات کی طرف متوجہ کیا کرے گا جنہیں وہ بھول چکے ہوں گے۔[۲]

(۳) اس چیز کا اہتمام کہ ہر دور میں ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ قَائِمَةً بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ اَوْ خَالَفَهُمْ...))[۳] ''میری اُمّت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی۔ جو لوگ ان کو چھوڑ جائیں گے یا ان کی مخالفت کریں گے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے.....''

اب عملی طور پر کیا ہوتا ہے؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک مجدد پیدا ہوا' اس نے مختلف پہلوؤں سے جدّوجُہد کی' دینی تعلیمات کی تطہیر کر کے اصل حقائق لوگوں پر واضح کر دیے۔ حالات اور زمانے کی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق دین کے مطالبات کی تشریح کر کے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ کچھ لوگ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے گرد جمع ہوئے۔اعوان و انصار نے اپنا اپنا کردار ادا کیا اور ایک مضبوط جماعت قائم ہو گئی۔ایسی کسی بھی جماعت کے ہراول دستے کے کارکن

---

(۱) ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر)

(۲) ((اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ یُجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا))
(رواہ ابوداؤد' ح:۴۲۹۱' راوی:ابوھریرہ رضی اللہ عنہ)

(۳) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق ...
(راوی: معاویۃ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما)

چونکہ علیٰ وجہ البصیرت اس میں شامل ہوتے ہیں اس لیے ان کی نظریاتی وابستگی خالص اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ البتہ وقت گزرنے کے کے ساتھ ساتھ اس جماعت میں عصبیت کا عنصر داخل ہونا شروع ہوجاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب اس کے بہت سے کارکنوں کی نظریاتی وابستگی کمزور ہوتے ہوتے برائے نام رہ جاتی ہے‘ لیکن وہ لوگ صرف اس لیے اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کا تعلق اس جماعت سے تھا۔ پھر تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے اس عصبیت کا دائرہ اور وسیع ہوجاتا ہے۔ اتنے عرصے میں جماعت کے اندر مضبوط شخصی تعلقات پروان چڑھ چکے ہوتے ہیں‘ رشتہ داریاں بن چکی ہوتی ہیں‘ کاروباری شراکت داریاں اپنی جڑیں مضبوط کرچکی ہوتی ہیں اور یوں یہ جماعت ایک معاشرتی حلقے یا فرقے کی صورت اختیار کرجاتی ہے۔ اب اس کے کارکن اپنی اپنی ترجیحات اور اپنے اپنے مفادات کے تحت اس جماعت یا فرقے کے ساتھ خود کو وابستہ کیے رکھتے ہیں۔

تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہر جماعت میں اس خرابی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اس حوالے سے سب سے بڑی حقیقت اور دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے: ((خَيْرُ اُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ))(۴) ’’میری اُمّت میں سب سے بہتر میرا دور ہے‘ پھر اس کے بعد والوں کا‘ پھر اس کے بعد والوں کا‘‘۔ یعنی حضور ﷺ نے خیر کے حوالے سے درجہ بدرجہ تین نسلوں کا ذکر فرمایا ہے۔ آپؐ کا یہ فرمان اتنی بڑی حقیقت ہے کہ تین نسلوں کے بعد خود آپ ﷺ کی قائم کردہ جماعت کو بھی زوال آ گیا۔ اور جب حضور ﷺ کی قائم کردہ جماعت بھی اس فطری عمل کے مطابق زوال کا شکار ہوگئی تو کوئی دوسری جماعت کیونکر اس کمزوری سے مبرّا ہوسکتی ہے؟ چنانچہ تیسری نسل (ایک صدی) کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر کسی مجدّد کو اٹھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور وہ ازسرِنو انہی بنیادوں پر جدّوجُہد کا آغاز کرتا ہے۔ اسی طرح یہ عمل قیامت تک کے زمانے تک تسلسل کے ساتھ چلتا رہے گا۔

چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے ہر دور کے مخلص مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حق شناسی کے سلسلے میں خود کو ہر قسم کی عصبیت سے بالاتر رکھ کر پوری دیانت داری سے جائزہ لیتا رہے کہ اس کے دور میں اللہ نے دین کی سربلندی کا کام کس کے حوالے کیا ہے اور وہ کون سی جماعت یا شخصیت ہے جو درست انداز میں اس راہ میں جدّوجُہد کر رہی ہے۔ پھر جب وہ اس سلسلے میں کسی واضح اور ٹھوس نتیجے پر پہنچ جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے تعلقات و مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اس شخصیت یا اس جماعت کا ساتھ دے جس کی جدّوجُہد کا رخ اس کی سمجھ اور معلومات کے مطابق درست ہو۔‘‘

انتہائی فکرمندی کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس اُمّت کے لیے تہتّر (۷۳) فرقوں میں بٹنے کی خبر سنائی ہے اور صرف ایک کے لیے نجات کی خوشخبری ہے‘ جبکہ بہتّر (۷۲) کے لیے نارِ جہنّم کی وعید ہے۔ العیاذ باللہ! نوٹ کیجیے کہ جہنّم کا نوالہ بننے والے کسی بھی فرقے کے بارے میں یہ گمان تک نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دیدہ ودانستہ ’’جہنّمی‘‘ ہوسکتا ہے۔ گمراہ فرقے انتہائی خلوص و اخلاص سے اپنی گمراہی پر جمے رہتے ہیں۔ البتہ اگر کسی کے

(۴) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابۃ‘ باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔

اندر یہ تشویش پیدا ہو جائے کہ اس کا تعلق حقیقتاً فرقہ ناجیہ سے ہے یا نہیں' تو اسے تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر بلا استثناء اُسی پیمانے کو سامنے رکھتے ہوئے خود احتسابی کی ضرورت ہے جو خود نبی مکرم ﷺ نے بیان فرمایا ہے' یعنی مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ(۵)۔

سامنے کی بات ہے کہ انسان کا کسی حقیقت کے بارے میں نکتۂ نظر اُس علم اور معلومات کی بنا پر قائم ہوتا ہے جو وہ اس حقیقت کے بارے میں رکھتا ہے یا حاصل کرتا ہے۔ جیسے جیسے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اُس حقیقت کے حوالے سے انسان کی یہ آزمائش شروع ہو جاتی ہے کہ وہ اس حقیقت کے ضمن میں اپنے فرسودہ لاعلمی پر مبنی خیالات پر مصر رہتا ہے یا اپنے خیالات اور نکتہ نظر کو علم کی رہنمائی میں تبدیل کر لیتا ہے۔ عام طور پر جن لوگوں کی نگاہ آخرت اور اس کے محاسبے پر ہوتی ہے ان کے لیے اعترافِ حقیقت آسان ہی نہیں واحد راستہ بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس دُنیا کی وجاہتوں اور سیادتوں کے اسیروں کے سامنے دُنیوی مصلحتیں آڑ بن جاتی ہیں اور بجائے حق کو قبول کرنے کے تاویلات کا سہارا لینے لگ جاتے ہیں۔ جماعتی سطح پر یہ طرزِ عمل ناجیہ فرقوں کا کیونکر ہو سکتا ہے؟

آخری بات اس ضمن میں یہ ہے کہ حکم و اقامتِ دین کے لیے قائم جماعتوں کی زندگی میں مختلف مراحل آتے ہیں۔ ابتدائی اور آخری و اقدامی مرحلے کے تقاضے بسا اوقات بالکل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً دعوت و تربیت کے مرحلے میں توسیع جماعت اور ایمانی و اخلاقی تربیت کی زیادہ اہمیت ہے' جبکہ اُس وقت جب ''الولاء والبراء'' کی تقسیم واضح ہو چکی ہو' بعض ضمنی بلکہ فروعی معاملات میں بھی انتہائی پوزیشن لینا مقصد کے اعتبار سے مجبوری بن سکتا ہے۔ یہ سخت پوزیشن البتہ مراحلِ دعوت و تنظیم میں تفرقہ بازی کا سبب بھی بنتی ہے اور فکری انتشار کا باعث بھی۔ بسا اوقات اس کا اضافی نقصان اہل اور باصلاحیت کارکنان سے محروم ہونا بھی ہوتا ہے جو مقصد میں پیش رفت کے ضمن میں یقیناً ایک مانع امر ہے۔

تفرقِ ممنوع اور گروہ بندی سے شعوری طور پر بچنے کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر یہ چند تنبیہات وگزارشات عمومی انداز میں تحریر کی گئی ہیں' کسی کو ہدفِ تنقید بنانا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ!

اللّٰھم ارنا الحقَّ حقًّا وارزقنا اتّبَاعَہ و ارنا الباطل باطلًا و ارزقنا اجتنابہ!

---

(۵) رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والحاکم' وقال : صحیح علی شرط مسلم۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

در جہانی واز جہاں بیشی

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

نبی اکرم ﷺ کی شانِ مبارک کی بابت جو کچھ بھی عرض کیا جائے گا آپ ﷺ ہمیشہ اس سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ ہمارے استاذ کہا کرتے ہیں کہ فارسی نعت کی روایت کا سب سے بڑا شعر انوری کا ہے:

در جہانی و از جہاں بیشی
ہمچو معنیٰ کہ در بیاں باشد

یعنی آپ ﷺ اس دنیا میں ہیں لیکن اس دنیا سے زیادہ ہیں، جیسے معنیٰ بیان میں ہوتا ہے لیکن وہ بیان سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہم ایسے بے بضاعت نبی کریم ﷺ کی شان کیا بیان کریں گے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

یا جو غالب نے کہا کہ:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم

تو کیوں نہ رسول کریم ﷺ کا وہ تعارف بیان کیا جائے جو ربّ کریم نے کرایا ہے اور یہ سب سے بڑا تعارف ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ (الحجرات:۷)

تفہیمِ مدعا کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک آپ ﷺ کا اپنے خالق و مالک ومحبوبِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق جس کو ہم اختصار سے تعلق مع الحق کہہ سکتے ہیں، اور دوسرا ماسوی اللہ سے تعلق، جس کو ہم تعلق مع الخلق کا عنوان دے سکتے ہیں۔ یہ دو پہلو ہوئے آپ ﷺ کی شخصیت کے، لیکن ایک تیسری جہت بھی قائم کی جاسکتی ہے، یہ ذاتِ حق اور اُس کی خلق کے درمیان ربط و رابطے کی جہت ہے۔ جب تک رسول اللہ ﷺ کی ان سبھی جہات کا صحیح ادراک حاصل نہ ہو آپ ﷺ کا تعارف ناقص رہ جائے گا۔

تعلق مع الحق کے حوالے سے دیکھا جائے تو آپ ﷺ عبدِ کامل تھے، آپؐ کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف اس کی عبدیتِ کاملہ تھی۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ ہم سے خوش گفتاریاں فرما رہے ہوتے تھے کہ اذان کی آواز آپؐ کے گوشِ مبارک میں پڑتی تو آپ ہمیں یوں چھوڑ کر اٹھ جاتے گویا آپ ہمیں جانتے ہی نہیں۔ یا آپ ﷺ کا سیّدہ سے یہ فرمانا کہ ''ہٹ جاؤ! مجھے اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے دو''۔ اس میں کیا

شبہہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے اساسی مقاصد میں اظہارِ دین شامل تھا اور اس کے لیے آپ ﷺ نے جاں گسل محنت کی‘ لیکن اگر پوچھا جائے کہ آپ ﷺ کا اپنا رجحان کس طرف تھا تو وہ یقیناً تبتّل الی اللہ ہی کی طرف تھا۔ اسی لیے قرآن حکیم میں حق تعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا: ﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا﴾ ’’بے شک دن میں آپ کے لیے ایک طویل شغل ہے۔‘‘

تعلق مع الخلق کے حوالے سے دیکھیں تو رسول اللہ ﷺ کی آمدِ مبارک سے جو شرف انسانیت کو حاصل ہوا اور جو فیض پورے عالَم نے آپ ﷺ سے حاصل کیا وہ لافانی ہے۔ اس کے بارے میں اقبال نے بہت صحیح کہا:

ہر کُجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

تو آپ ﷺ لوگوں کے لیے باعث نفع بنے اور بنے رہیں گے‘ لیکن آپ ﷺ کی اس شان کو باقی شانوں پر غالب قرار دے دینا ایک دوسری بات ہے۔

دورِ استعمار میں جہاں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو نشانے پر لیا اس کے نتیجے میں بہت سے اسلامی مفکّرین نے معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں سیرت نگاری کا بھی ایک نیا اسلوب اختیار کیا گیا جس میں Humanization of the Prophet ایک اہم عنصر تھا۔ کوشش کی گئی کہ پیغمبر ﷺ کی شخصیت اور ان کی حیاتِ مبارکہ کو خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا اور دکھایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی بشریت اور افادیت کے پہلو کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا گیا۔ محمد حسن عسکری کے الفاظ میں: ’’لیکن اب سرسیّد کے زیرِ اثر اور پیروئ غرب کے شوق میں لارڈ مکالیے کے عقیدت مند اُبھرنے لگے تھے جو کہتے تھے کہ اسلام افضل ترین مذہب ہے‘ کیونکہ یہ مذہب ہے ہی نہیں‘ بلکہ دنیاوی زندگی بسر کرنے کا ایک سیدھا سادہ راستہ ہے اور آنحضرت ﷺ محض پیغمبر نہیں بلکہ ’مصلح‘ اور ’ریفارمر‘ ہیں۔‘‘

ترازو کا جھکا ہوا پلڑا‘ دوسرے پلڑے کو ہلکا کر کے اٹھا بھی تو دیتا ہے۔ پس اس عدم اعتدال کی زد شخصیتِ محمدی ﷺ کی اس جہت پر پڑی جسے ہم نے خالق و مخلوق کے درمیان رابطے کا نام دیا تھا۔ جو اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے کا کام تھا‘ جسے کارِ نبوت و رسالت کہا جا سکتا ہے۔ تو یہ پہلو کچھ دب سا گیا۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ کچھ اس حوالے سے ضرور لکھا جائے۔ ذاتِ رسول ﷺ کے افادی پہلو یا زیادہ واضح الفاظ میں کہیں تو مادّی افادیت کے پہلو سے ذرا بچ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ ذاتِ رسول ﷺ کے ایمانی ثمرات کیا ہیں۔ ایمان بالرسالت کس طرح میرے ایمانِ باری تعالیٰ میں اضافہ و تکمیل کا باعث بنتا ہے۔

ایمان بالرسالت کے قانونی اور اعتقادی پہلو واضح ہیں‘ لیکن اس کی ایک حکیمانہ جہت بھی ہے‘ جسے پیش نظر

رہنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ پر ہمارا ایمان غیب کو واجب الاثبات بنانے والی سب سے بڑی قوت ہے۔ اس ایمان کی مدد سے ہمارے تمام عقائد میں ایک زندہ تیقّن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس حُجّت کو قائم فرمانے آئے تھے وہ حُجّت اپنے دو مظاہر رکھتی ہے: قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ۔ قرآن، ایمان کی حقیقت کو ذہن اور ارادے پر حتماً غالب کر دیتا ہے اور ذاتِ رسول اللہ ﷺ آدمی کی طبیعت میں اس کا استحضار پیدا کر دیتی ہے۔ گویا آپ ﷺ محض حُجّت لے کر ہی نہیں آئے تھے بلکہ اللہ نے آپ ﷺ کو حُجّت بنا کر بھی بھیجا تھا۔

عقائد کا جو بھی کُلّی بیان اور اس کا فہم قرآن سے میسّر آتا ہے، رسول اللہ ﷺ سے تعلق اس فہم کے ہر جزء کو ہمارے نفس میں اسی زندگی کے ساتھ حاضر کر دیتا ہے جس سے غیب کے حدود بھی نہیں ٹوٹتے اور وہ حضور بھی قائم ہو جاتا ہے جو ایمان بالغیب کے مدارِ یقین بن جانے کی بنیادی ضرورت ہے۔ ایمان جس غیر متزلزل یقین کا تقاضا کرتا ہے اس یقین کو ہمارا شعور اپنی کسی بھی صلاحیت اور قوت سے حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اپنی نارسائی کا اعتراف تو دور کی بات، اپنی نارسائی پر قانع بھی نہیں رہ سکتا۔ شعور چونکہ ایک تحکّمانہ قسم کی واقفیت اور تیقّن کا عادی ہے، جو اسے تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتا رہتا ہے، تو غیب اگر اسے بتا بھی دیا جائے تو یہ غیب اس کے دلائل کا منتہا تو ہو سکتا ہے مگر اسے یقین کے موقف پر اس طرح استوار نہیں کر سکتا جس طرح کے تیقّن سے یہ مانوس ہے۔

عقل تصوّر سازی میں چاہے کتنا بھی انہماک رکھے اس کے تصوّرات اس کی تسکین نہیں کر سکتے۔ یقین کی ہر قسم میں شعور کی وہ تسکین ناگزیر ہے جو تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ شعور، غیب اور امورِ غیب کے مشاہدے اور تجربے سے محروم ہے، اور اپنی ساخت کے اعتبار سے وہ ان دونوں کی ضرورت کو محسوس بھی کرتا ہے تو اب حل کیا ہو سکتا ہے مگر یہی کہ شعور کو ایک ایسی ہستی سے متعارف کرایا جائے جو ایک طرف اس کے مشاہدے و تجربے کے دائرے میں آتی ہو اور دوسری طرف اس ہستی کو غیب کا تجربہ و مشاہدہ بھی حاصل ہو، تاکہ شعور بالواسطہ سہی لیکن غیب کو اپنے لیے مشاہدہ بنا کر اپنے یقین کو برقرار رکھ سکے۔

رسالت کی ایمانی اہمیت یہ ہے کہ یہ شعور کو اس دوطرفہ شہود تک پہنچا دیتی ہے جس کا ایک سرا یہاں ہے اور دوسرا غیب میں، اور یہ دونوں سرے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں..... اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل۔ جیسے ایک بے کنار سمندر کا ساحل اس کے اَن دیکھے کناروں پر بھی یقین پیدا کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ غیبِ مطلق کو ماننے کا خدائی تقاضا پورا ہی نہیں ہو سکتا جب تک رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے دونوں اصول یعنی انسانیت اور رسالت سے مؤمنانہ نسبت نہ پیدا کی جائے۔ آپ ﷺ کی یہ دونوں جہتیں ایک دوسرے میں اپنے اپنے کمالات کے ساتھ مدّغم ہیں اور یہی ادغام غیب کو شہود کی طرح موجبِ یقین بناتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی مبارک شخصیت کی یہ دو جہتیں ایک دوسرے میں مدّغم کیسے ہیں، اس کی کچھ تفصیل یہ ہے: رسول اللہ ﷺ کی رسالت ہو یا بشریت دونوں کا قوام ایک ہی ہے، یعنی رسالت کے کمالات عین بشریت کے کمالات

ہیں اور آپ ﷺ کی بشریت کے مراتب رسالت کے مقامات سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے دو متحد المعانی اَلفاظ۔ یعنی لفظ ایک دوسرے سے ممتاز ہونے کے باوجود معنوی اتحاد رکھتے ہیں اور ان پر آخری حکم اتحاد کا لگایا جائے گا نہ کہ امتیاز کا۔ جس طرح ہم جانتے ہیں کہ نبی جس سلسلۂ معجزات کو لے کر آتا ہے اس میں پہلا معجزہ وہ خود ہوتا ہے۔ یہ الٰہی معجزہ عصمت کی شکل میں ظہور کرتا ہے' یعنی رسول اللہ ﷺ میں رسالت اور بشریت کا منتہائی اتحاد' نقطۂ عصمت پر واقع ہوتا ہے۔ یہ عصمت اس کی بشریت کو بھی حاصل ہے اور رسالت کو تو خیر ہے ہی۔ عصمت' اللہ تعالیٰ کی مستقل اور کُلّی حفاظت کا نام ہے۔ اس حفاظت کے دو پہلو ہیں: شر سے حفاظت اور نقص سے حفاظت۔ شر اَخلاقی ہے اور نقص وجودی۔ نبی' کامل الاخلاق تو ہوتا ہی ہے' کامل الوجود بھی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ مستقل حفاظتی نظام جسمانیات کے دائرے میں نہیں ہے' مثلاً یہ کہ بیماری اور تکلیف وغیرہ نہ آئے۔ عصمت کا حقیقی جوہر یہ ہے کہ بندے کا مظہرِ حق ہونا کسی بھی پہلو سے مجروح نہ ہو یا ادھورا نہ رہ جائے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ حق کی مظہریت پر فائز بندہ اپنی ایک جہت سے مظہرِ حق ہو اور دوسری جہت سے نہ ہو۔ سو رسول اللہ ﷺ کی شانِ کمال یعنی حق کی آخری اور اکمل مظہریت جہتِ رسالت سے بھی ظاہر ہے اور جہتِ بشریت سے بھی واضح ہے۔ آپ ﷺ سے ایمان کی حالت میں انسانوں میں پائے جانے والے تعلق کی کیفیت کے ساتھ متعلق ہو جانا آپ ﷺ کی رسالت کے محتوی کا بھی حضور پیدا کر دیتا ہے۔

دین ایک اندازِ بیان کی رو سے حکم اور تعمیل کا ایک مکمل سلسلہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اَقدس اس سلسلے کا ایک فعال اظہار ہے' جو آپ ﷺ کے ماننے والوں میں غیب سے وابستگی کی طبعی مناسبت پیدا کر دیتا ہے' یعنی حکم کا تعلق عالَمِ غیب سے ہے اور تعمیل کا عالَمِ شہود سے۔ رسول اللہ ﷺ سے اظہار پانے والی تعمیل کی صورتیں ایمان کی آنکھ سے مشہود ہو کر حکم سے بھی زندہ تعلق پیدا کر دیتی ہیں' جو ایمان کے یقین بننے کا سب سے طاقتور ذریعہ ہے۔ کیا ہم دیکھتے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں حکم کا محفوظ ہونا اور تعمیل کا کامل ہونا ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے فاصلے کو ختم کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ سے عبودیت کے منتہا کا اظہار تو ہوتا ہی ہے' معبودیت کا بھی مکمل تعارف ہو جاتا ہے۔ اس طرح آپ ﷺ کو ماننے والا بندگی کے ہر مرحلے پر معبودیت کی ایک شان کا ادراک اور تجربہ کر لیتا ہے۔ غیب سے شعور کو متعلق کرنے اور رکھنے کا اس کے علاوہ کوئی انداز فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی معرفت کا جو کمال سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں نظر آتا ہے وہ قرآن کے باہر کہیں نہیں پایا جاتا: کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ یعنی آپ ﷺ کے اَخلاق کی اصل اور تفسیر قرآن ہے۔ اپنی معنویت میں یہ جملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ اَخلاقِ رسولؐ کا قرآن ہونا اس حقیقت پر کامل ترین دلالت رکھتا ہے کہ آپ ﷺ میں بشریت اور رسالت متحد الاصل ہیں۔ اس قولِ مبارک کا ممکن حد تک مکمل مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ قرآن کے بنے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کو کسی ایک پہلو سے جاننا دوسرے نامعلوم پہلوؤں کا یقین بھی فراہم کر دیتا ہے۔

یعنی آپ ﷺ کی شخصیت کی شان‘ شہودِ رسالت کے جوہرِ غیب پر گویا حسّی دلالت کرتی ہے۔ اسی کو ہم اس بات سے تعبیر کر رہے ہیں کہ ایمان بالغیب میں یقین کی کیفیت کا حصول ایمان بالرسول کے بغیر محال ہے۔

خوش رہیں تیرے دیکھنے والے
ورنہ کس نے خدا کو دیکھا ہے!

ایمان کا سب سے پہلا لازمہ اطاعت ہے۔ ایمان کا فطری تقاضا اور اوّلین مطالبہ اگر غور کیا جائے تو اطاعت ہی ہے۔ ایمان باللہ ہو یا ایمان بالرسول‘ دونوں پہلے عزمِ اطاعت کو تحریک دیتے ہیں اور پھر یہی عزم جذبۂ محبّت میں منقلب ہو جاتا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ ایمان انسان کی اصل حقیقت یعنی بندگی کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اس کی تصحیح اور تکمیل کا واحد سبب بنتا ہے۔ بندگی بالقوّۃ کو عمل میں لانے کے لیے پہلے تصحیح درکار ہے اور پھر تکمیل۔ اطاعت اسی تصحیح کو بالفعل ممکن بناتی ہے اور محبّت اس کی بنیاد پر بندگی کی تکمیل کرتی ہے‘ گویا اطاعت صحتِ بندگی ہے اور محبّت کمالِ بندگی۔ تاہم اس اصول میں کچھ ایسی باریکیاں بھی ہیں جنھیں سمجھ لینا ضروری ہے:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مُطاع ہونا اُس کی حاکمیت کے ساتھ معبودیت کو بھی شامل ہے‘ لہٰذا اللہ کی اطاعت میں اُس کی عبادت بھی داخل ہے۔ اسی فقرے کو یوں بھی کہا جائے تو درست ہوگا کہ اللہ کی عبادت میں اس کی اطاعت بھی موجود ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ انسانی ادراک میں یہ دونوں تصوّرات یکساں شدّت کے ساتھ موجود ہیں کہ معبودیت کو اللہ کی ذات کے ساتھ زیادہ قریبی اور قوی نسبت حاصل ہے‘ جبکہ دوسرا تخیّل یہ ہے کہ حاکمیت اقرب الی الذّات ہے۔ ان دونوں تصوّرات میں فرق صحیح اور غلط کا نہیں‘ بلکہ مزاجِ بندگی کا ہے‘ اور یہ اختلاف عقلی طور پر کسی تضاد کا حامل نہیں ہے اور فطری طور پر تو بالکل ہی حقیقی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں بھی دو باتیں ہیں۔ ان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کا مُطاع ہونا ایک تو شارع کی حیثیت سے ہے اور دوسرے نمونۂ کمال کی حیثیت سے۔ اس میں بھی ترجیحات کا ذوقی اختلاف ہوسکتا ہے۔ کوئی محض احکام تک محدود رہ کر مطمئن ہے اور کوئی رسول اللہ ﷺ کے نمونۂ کمال ہونے کی تمام تفصیلات کو مقصود بنا کر ان کے ایک ایک جزء کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سُنّت کے موضوع پر بہت سے اختلاف شروع سے چلے آ رہے ہیں‘ یعنی رسول اللہ ﷺ کی مطاعیت کے اجزا کی فہرست میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تو اب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس اختلاف کی بنیاد پر اطاعتِ رسولؐ ہی کو تفصیلات میں غیر محکم اور مخدوش قرار دے دیا جائے۔ اس طرح تو اللہ کی اطاعت بھی لپیٹ میں آجائے گی‘ کیونکہ اس کے مظاہر کا تعین بھی تقریباً محال ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگ اطاعت کو حکم کے مطابق رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے حضرات اس معاملے میں اس ذوق کو فیصلہ کن حد تک دخیل رکھنا چاہتے ہیں جو حکم کے خلاف نہیں مگر حکم تک محدود بھی نہیں ہے۔ اس بات کو ہم آگے چل کر کھولیں گے کہ ذوق کا علم کے مطابق ہوتے ہوئے بھی اس تک محدود نہ رہنے کا کیا مطلب ہے۔ اس وقت سمجھنے کی چیز یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت دراصل مجاز ہے اللہ کی اطاعت کا۔

اس وجہ سے ان دونوں اطاعتوں سے بننے والا ماحول اپنے جوہر میں یکساں ہونے کے باوجود اپنی تفصیل میں ایک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو خالق‘ حاکم اور معبود ماننا اُس کی اطاعت کی شرائط میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان حیثیتوں کا مستقل استحضار ہی اُس کی اطاعت کو ممکن بناتا ہے اور یوں بھی نفسِ اطاعت اپنی ماہیت میں مُطاع کے لیے بہر پہلو الٰہ ہونے کا تقاضا رکھتی ہے اور اس تقاضے کی تسکین کے بغیر اطاعت کا صدور وظہور محال ہے۔ ورنہ دین کے مطلوبات اطاعتِ رسولؐ سے اعلیٰ درجے میں پورے ہو جاتے ہیں‘ مگر ایک چیز رہ جاتی ہے اور وہ ہے مُطاعِ مطلق کی معبودیت کا یقین جس کے بغیر اطاعت کا فطری داعیہ اور استعداد حرکت میں نہیں آسکتی تھی۔ اطاعت اپنے منتہا پر جذبۂ عبادت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ہم کچھ فطری حقائق کا تجزیہ کریں تو‘ ان شاء اللہ‘ یہ واضح ہو کر سامنے آجائے گا کہ اللہ کا مُطاع ہونا فطرتِ بندگی میں اُس کی معبودیت کے خلقی شعور ہی سے متحقق ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات بندگی کے ان فطری اساسات کی صحیح پرداخت اور درست تکمیل کے لیے مُطاعیت کے درجے پر رکھی گئی ہے۔ آپ ﷺ ہی کی بدولت اقتضائے بندگی اپنی تکمیل اور تصحیح کے یقینی ذرائع حاصل کرتا ہے۔ آپؐ درمیان سے ہٹ جائیں تو خود اللہ ایک مفروضہ ہے‘ اس کا مطاع وغیرہ ہونا تو ثانوی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وحی پر ہمارا ایمانی اعتماد اُس وقت تک محض ایک تصوّر ہے جب تک صاحبِ وحی اس تصوّر کے مقابل میں تصدیق بن کر سامنے نہ آئیں‘ یعنی خبر پر اعتماد دراصل خبر دینے والے پر اعتماد کا نام ہے۔ اسی طرح حق سے نسبت دراصل حق کو لانے والے کے ساتھ تعلق پر منحصر ہے۔ رسالت بیچ میں سے ہٹ جائے تو بندگی اور معبودیت کے تعلق کی ہر صورت محال ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ تصحیح بندگی کے موقف پر کھڑے ہو کر اطاعت کا رنگ قانونی ہوگا اور یہ بہت ضروری ہے‘ بلکہ اطاعت کے تمام اجزاء کا دارومدار ہی اطاعت کی قانونی اساس پر ہے‘ تاہم اس سے اطاعت کے ضروری عملی حدود تو متعیّن ہو جاتے ہیں مگر ذوقِ اطاعت اور استعدادِ تعلق کا احاطہ نہیں ہوتا۔ یہ احاطہ اسی وقت ہوگا جب فرائض نوافل کے محرک بنیں گے اور اطاعتِ رسولؐ اتباعِ رسولؐ پر غلبے کے ساتھ مائل کرے گی۔

اس مبحث میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے حوالے سے اگر غور کریں تو یہی بات ٹھیک ہے کہ اللہ کی محبّت ہمیشہ اللہ کی اطاعت کا ثمر ہوگی‘ لیکن رسول اللہ ﷺ کے معاملے میں یہ شرط کہیں کہیں اٹھ بھی جاتی ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت فی الواقع آپؐ کی محبّت کا نتیجہ ہے۔ اس فرق کی ایک وجہ یہ ہے کہ کمالِ بندگی کا کوئی مرتبہ بھی صحتِ بندگی کی پختہ تحصیل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا‘ جبکہ نفس کی صلاحیتِ تعلق کا حال یہ ہے کہ یہ اپنی استعدادِ اطاعت کی پوری کمک کے بغیر بروئے کار آسکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نفسِ بندگی کی صلاحیتِ تعلق کا مقصود ہیں اور اللہ اس کی استعدادِ اطاعت وعبادت کا‘ جس کی کارفرمائی کا انداز صلاحیتِ تعلق سے مختلف ہے۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا مُطاع ہونا فی الحقیقت اطاعتِ الٰہیہ کا واحد ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کی اطاعت اپنی جگہ مقصود ہوگئی ہے۔

اطاعت کے بیان کے بعد اتباع کے بارے میں بھی کچھ اصولی باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ اتباع کے سلسلے میں پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کسی عمل یا خیال کی نہیں ہوتی بلکہ شخصیت کی ہوتی ہے۔ جیسے اطاعت کا مقصود تعمیلِ امر ہے، لیکن اتباع کا مطلوب متبوع کی پوری شخصیت کا رنگ اختیار کرنا ہے۔ اور اس کا مزاج قانونی نہیں ہوتا یعنی یہ عمل کسی کام کی انجام دہی یا کسی حکم کی بجا آوری کی کیفیت نہیں رکھتا، بلکہ اس کے پیچھے نفس کا بنیادی داعیہ یہ ہوتا ہے کہ اس مجموعی کمال تک پہنچا جائے جو متبوع کی ذات میں خاصے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے تمام روّیوں اور اعمال سے منعکس ہوتا رہتا ہے۔ اتباع لگ کر چلنے کو کہتے ہیں یا قدم، قدم پر رکھنے کا عمل اتباع ہے۔ اس کا محرک اطاعت سے زیادہ وہ جذبۂ محبّت ہوتا ہے جو آدمی کو اپنے متبوع سے تعلق کے دائرے میں سمائے رہنے پر مائل کرتا ہے۔ اطاعت اور اتباع واحد الاصل ہیں، کیونکہ مُطاع اور متبوع ایک ہی ذات ہے۔ ان میں کچھ امتیازات یقیناً ہیں، مگر وہ اسی طرح کے ہیں جیسے کہ ایک کُل کے دو اجزاء وحدت پر قائم ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے ممتاز بھی ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنے کل کے ساتھ نسبت کا مزاج اور معنویت دوسرے سے منفرد ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے تعلق کو اگر ہم کل تصوّر کرلیں تو اطاعت اور اتباع کُل کے وہ ایسے دو لازمی اجزاء ہیں جن میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو تعلق کا کل ناقص رہ جائے گا۔

ان دونوں لازمی اجزاء کی اپنے کُل کے ساتھ نسبت کی کیفیت میں جو امتیازات ہیں ان میں سے کچھ ہم ابھی بیان کریں گے، اور اسی طرح معنوی سطح پر بھی ان اجزاء کا اپنے کل کے ساتھ تعلق کہاں کہاں منفرد ہے اس پر بھی نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ پہلے مزاج یا کیفیت کو لے لیتے ہیں۔ مزاج سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس جزء کی اندرونی بناوٹ اور اس کا اندازِ حرکت کیا ہے اور اس جزء کی کارفرمائی بعض احوال کی حامل ہے اور بعض کی بانی۔ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ احوال کیا ہیں؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا شاید زیادہ قابلِ فہم ہو کہ اطاعت اور اتباع کی تحریک اور تاثیر میں کچھ بنیادی امتیازات ہیں، جن میں سے چند کا تعلق نفس سے ہے اور بعض کی نسبت خود اس پیغام کی طرف ہے جس کی اساس پر یہ دونوں قوتیں اپنے مقصود کا تعین کر کے عمل میں آتی ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اطاعت اور اتباع میں مزاجی اور تاثیری امتیازات یہ ہیں:

۱) اطاعت کا اوّلین محرک خوف ہے، جبکہ اتباع کا محبّت۔

۲) اطاعت کا مقصود سزا سے بچنا ہے، اتباع کا مقصود رضا کا حصول ہے۔

۳) اطاعت کی بنیادی قوت ارادے سے فراہم ہوتی ہے، جبکہ اتباع کی اصل طاقت طبیعت سے میسّر آتی ہے اور ایک نوع کے حال پر ختم ہوتی ہے۔

۴) اطاعت میں ہمہ وقت مستحضر رہنے والا تسلسل محال ہے، جبکہ اتباع میں ممکن ہے۔

۵) اطاعت امر میں ہوتی ہے، جبکہ اتباع ذات میں ہوتی ہے۔

۶) اطاعت اپنے مزاج میں بندگی پر عملی استقامت اور ارادی استحکام کا نام ہے، جبکہ اتباع بندگی میں مسلسل

ترقی کرنے کا عمل ہے۔

۷) اطاعت میں مُطاع کا حضور نہ ہونا کسی نقص پر دلالت نہیں کرتا' جبکہ اتباع میں متبوع کا حضور شرطِ لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔

۸) اطاعت میں ایک نوع کی انتخابی حس بہت قوت سے برسرکار رہتی ہے' جبکہ اتباع کا مزاج انتخابی اور جزوی نہیں ہوتا' بلکہ عمومی اور مجموعی ہوتا ہے' یعنی اطاعت میں احکام کی درجہ بندی اور ترجیحات کا عمل نہ ہو تو اس کی بجا آوری مشکل ہو جاتی ہے' جبکہ دوسری طرف اتباع میں درجہ بندی اور ترجیحات داخل ہو جائیں تو اس میں نقص واقع ہو جاتا ہے۔

۹) اطاعت کچھ کرنا ہے جبکہ اتباع کچھ بننا ہے۔ دین ایک جہت سے جس احکامی structure کا نام ہے اس سے کچھ مخصوص اعمال ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ اخلاق کی بنیاد بھی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں یہ مطالبہ پایا جاتا ہے کہ اس کی تعمیل کو عمل اور اخلاق دونوں میں جاری کرو' تو حکم کی تعمیل عمل میں ہو تو اطاعت اور اخلاق میں ہو تو اتباع۔ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بھی عین یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہم بندگی کے مستقل حدود میں رہنے کی قوت اطاعت سے حاصل کرتے ہیں اور بندگی کی اخلاقی بناوٹ کے قیام اور اس کی تکمیل کی تمام صورتیں آپ ﷺ کے اس مزاجِ عبودیت سے اخذ کرتے ہیں جو آپ ﷺ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے یکساں کمال کے ساتھ ظاہر ہے۔ مراد یہ کہ آپ ﷺ کی جہتِ رسالت ہو یا جہتِ بشریت دونوں ایک ہی طرح کے کمالات سے کامل ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ ﷺ کو نماز بھی مرغوب تھی اور ٹھنڈا پانی بھی۔ ان دونوں میں مادّۂ رغبت ایک ہے۔ اتباع کے بغیر آدمی رسول اللہ ﷺ کے اس کمالِ حقیقی سے زندہ تعلق نہیں پیدا کر سکتا جس کا ظہور آپ ﷺ کی شخصیت کے تمام اجزاء میں مشترک ہے۔

۱۰) بندگی مثال کے طور پر عاجزی کا نام ہے اور اس عاجزی کا اظہار اطاعت اور اتباع میں منقسم ہے۔ فرق یہ ہے کہ عاجزی کا جو شعور اطاعت کے پیچھے کارفرما ہے وہ اس شعور سے مختلف ہے جو اتباع کی بنیاد بنتا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اطاعت میں عاجزی کا تصوّر پایا جاتا ہے کہ بندہ اپنی فلاح کا سامان خود سے نہیں کر سکتا۔ یہاں عاجزی کی نوعیت عقلی اور عملی ہے' جبکہ اتباع میں عاجزی کی نوعیت روحانی اور وجودی ہے۔ اطاعت کا کوئی بھی تصوّر عاجزی میں ناگواری کے عنصر کو زائل نہیں کرتا' جبکہ بندگی بندے کی بنیادی ضرورت کے طور پر سامنے رہتی ہے اور بندہ اس میں مزید اضافے کا خواہش مند رہتا ہے۔ اطاعت بندے کو عاجزی کے ایک دائرے میں رکھتی ہے' جبکہ اتباع میں اس کے نئے نئے دائرے بنتے اور عبور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گویا بندگی یہی ہے کہ عاجزی کو ایک سطح پر زائل کیا جائے اور دوسری سطح پر محفوظ رکھا جائے۔

۱۱) اطاعت سے جبر منہا نہیں ہو سکتا اور اتباع میں جبر داخل نہیں ہو سکتا۔

۱۲) اطاعت سے احکام کا تاریخی تسلسل اور تعمیل کے عملی حدود کی حفاظت ہوتی رہتی ہے' جبکہ اتباع میں بندگی

کے بنیادی احوال اور اس کے مجموعی مزاج کی تشکیل ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا متبوع ہونا آپؐ سے محبّت کی نسبت پر استوار ہے۔ جہاں تعلق میں کوئی شرط نہ پائی جائے‘ یعنی مُطاع کا مُطاع ہونا بھی مطلق ہو اور مطیع کا مطیع ہونا بھی مستقل ہو‘ ایسے تعلق میں محبّت کا مطلب دیگر تعلقات میں کارفرما محبّت سے مختلف ہو جاتا ہے۔ محبّت بہر حال ایک جذبۂ فنا ہے۔ ہدایت کے ان قطبین کے تعلق میں طلب کی جانے والی محبّت کا لازمی تقاضا ہے کہ اُمتی اپنے رسول ﷺ کے ساتھ نثار ہو جانے والے جذبے سے متعلق رہے۔ یعنی یہ محبّت مسلسل اُکساتی رہے کہ ہم خود سے خالی ہو کر رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے بھر جائیں۔ اتباع کی اصل غایت یہی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی معلوم شخصیت کو اپنے وجود کی تشکیلِ نو کا واحد ماخذ بنائیں۔ یہی کمالِ بندگی کا منتہا ہے اور اس کی طرف لپکنے کا مزاج پیدا کیے بغیر عبودیت میں سچائی کی اصل ایسی مجروح ہو جاتی ہے کہ پھر تعمیل کی قانونی قوت بھی اس کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ ازالہ تو دُور کی بات ہے خود وہ قوت مطلوبہ معیار پر آنے کے قابل نہیں رہتی۔

اس پس منظر میں دیکھیں تو بالکل واضح ہو جائے گا کہ آپ ﷺ کے مزاجِ مبارک یعنی اخلاق و خصائص کی مستقل قبولیت اور ان کی طرف اٹل رغبت رکھے بغیر ہم اپنے اندر انسانیت کا وہ جوہر پیدا ہی نہیں کر سکتے جو حق کی قبولیت اور اس قبولیت پر ثابت قدم رہنے کے لیے لازماً درکار ہے۔ حق پرستی‘ صداقت‘ نیکی وغیرہ کی جڑ اگر طبیعت میں محکم نہ ہو تو ان کا زیادہ اعتبار نہیں ہے۔ اسی طرح اَحکام کی تعمیل اگر اقتضائے بندگی نہ بنے تو اس پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اتباع جو حق کے ذوق اور قدر شناسی سے کی جاتی ہے دراصل ہمیں حق کے ساتھ وابستگی میں سچا‘ مخلص اور بے نفس بناتی ہے۔ مجھ سے پوچھا جائے تو مَیں تو کم از کم یہی کہوں گا کہ رسول اللہ ﷺ کے معاملے میں محبّت کو اطاعت پر اوّلیت حاصل ہے۔ آپ ﷺ کے حقوق محبّت سے شروع ہوتے ہیں اور اطاعت سے تصدیق پا کر اسی محبّت پر تمام ہوتے ہیں۔

اتباع کے معاملے میں اِفراط و تفریط بھی پائی جاتی ہے جو اکثر موقعوں پر خلافِ سُنّت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے کئی مواقع پر اپنے کسی خاص معمول کی نقل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ایسی چیزوں کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اتباع کسی بے لگام جذبۂ محبّت کے سپرد نہیں کیا جا سکتا‘ اس کی یقیناً کچھ حدود ہیں۔ آپ ﷺ نے بعض معاملات میں جو دینی نوعیت کے بھی تھے اور تہذیبی نوعیت کے بھی‘ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی پیروی یا نقل سے صریح لفظوں میں روکا ہے‘ مثلاً صومِ وصال اور اپنی طرح کا لباس پہننا وغیرہ۔ ان واقعات کو ذرا اس نظر سے بھی دیکھیں کہ ان میں جذبۂ اتباع پر روک لگانے کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا‘ بلکہ اس جذبے کے اظہار کی بعض ایسی صورتوں پر بندش لگائی گئی ہے جن کا جائز یا ناجائز ہونا موضوع نہیں بنایا گیا‘ بلکہ ان میں بعض نقصانات کا اندیشہ ہونے کی وجہ سے ان سے روکا گیا۔ مثال کے طور پر صومِ وصال کی مخالفت میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا کہ تمہارا یہ عمل گناہ تھا‘ اس سے توبہ کرو‘ بلکہ اس کی مخالفت کا واضح محرک یہ تھا کہ اس سے تمہاری جسمانی قوت گھٹ جائے گی اور اسی نوع کے

بعض ضروری حقوق سے غافل کر دے گی یا ان کی ادائی کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ جیسے سیّدنا عثمان بن مظعون‘ سیّدنا ابن مسعود اور بعض اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کو شب بیداری اور صومِ مسلسل سے روکتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہی فرمایا تھا کہ تم میرے لائے ہوئے نظامِ حقوق و فرائض کی پاسداری کے لائق نہیں رہو گے۔ ایسی ممانعتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے معمولات کا محرک بننے والا والہانہ جذبۂ اتباع خود اپنی جگہ درست نہ تھا۔ اب رہی حدودِ اتباع کی بات تو اس میں ایک اصول کو ضرور پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے:

اصول: اتباع کے نام سے اطاعت کی حدود کو توڑا نہیں جا سکتا‘ کیونکہ اتباع اپنے نفس میں ذوقِ اطاعت ہی کی تکمیل ہے‘ اور جو جذبۂ تعلق اس کی اساس ہے‘ اس جذبے کی انتہائی شدّت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا رسول ہونا قلب اور ذہن میں مرکزیت کے ساتھ حاضر رہنا چاہیے۔ اس اصول کی روشنی میں اتباع کی متعین حدود بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔

راستے عام ہی ہوتے ہیں‘ کسی چلنے والے کے قدموں کے نشان انھیں خاص بنا دیتے ہیں۔ ایک سیدھی سادی زندگی کی راہ تھی جسے سب گزارتے آ رہے تھے‘ لیکن جب میرے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان راہوں پر چلے اور آپؐ کے وحی کے سانچے میں ڈھلے مزاجِ مبارک نے اپنا اظہار کیا تو ان راہوں کو منزلوں کی شان دے دی۔ یہ اظہار اخلاق میں بھی ہے‘ عادات میں بھی ہے اور طبعی امور میں بھی ہے‘ تو ان سبھی میدانوں میں اتباع کرنا ہے۔ البتہ اس میں دھیان رکھا جائے گا کہ کون سی چیزیں لائقِ تلقین ہیں اور کون سی نہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دودھ مرغوب تھا تو اس رغبت کو خود میں پیدا کرنے کی خواہش اور کوشش بندگی کے بنیادی مزاج کا لازمہ ہے‘ لیکن اگر اسی کو تلقین و تبلیغ کا موضوع بنایا جائے تو شاید خلافِ مصلحت ہو جائے گا۔ قانونی پیچیدگیوں سے صرفِ نظر کر کے دیکھیں تو اتباع کا سارا مقصد یہ ہے کہ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبّت کے تقاضے پورے ہو جائیں اور دوسرے وہ مزاجِ بندگی میسّر آ جائے جس کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نمونۂ کامل تھے۔ مزاجِ بندگی کی ترکیب شاید کچھ ابہام رکھتی ہے اس لیے اس کے مفہوم کو متعین کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ اس اصطلاح سے ہماری مراد یہ ہے کہ نفس میں عبودیت کی طرف سے بنیادی مزاحمتوں کا ایسا خاتمہ ہو جائے کہ ہمارا بندہ ہونا ہمارے شعورِ ذات کے ہر حصے میں ایک ہی انداز سے سرایت کر جائے‘ یعنی ہم باعتبارِ ساخت‘ اللہ کے بندے بن جائیں‘ جس کے وجود کی تمام قوتیں بندگی کی غایت کو اندر باہر سے پورا کرنے میں مرتکز ہوں۔ انسانی شخصیت میں اور اس کی تشکیل کے ہر عمل میں طبیعت سب سے زیادہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جو چیز ہماری طبیعت میں جگہ نہ بنائے ہم خود کو اس سے پوری طرح منسوب نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مزاجِ مبارک میں ڈھل جانے کی مسلسل کوششوں کے علاوہ اور کوئی ایسا راستہ ہمارے پاس نہیں ہے جس پر چل کر ہم بندگی کو اپنی طبیعت کے تمام داعیات کا واحد جوہر بنا سکیں۔

محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اتباع کے دائرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عاداتِ مبارکہ بھی آ جاتی ہیں‘ تاہم اس معاملے میں مشکل یہ ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہر عادت اور ہر معاشرتی عمل لائقِ اتباع قرار پائے تو اس سے بعض

بڑے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور معاشرت میں کچھ ایسی مشکلات آ سکتی ہیں جو دین کے نظام العمل کو شاید ممکن ہی نہ رہنے دیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم متعین کر کے بتائیں کہ اتباع کا دائرہ کن امور کا احاطہ کرتا ہے اور کون سی چیزیں اس سے باہر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت دو جہتیں رکھتی ہے' ایک جہت سے آپ ﷺ عرب تھے اور اس روایت میں رہتے ہوئے آپ ﷺ نے بعض اوضاع و اعمال اختیار فرمائے' حتیٰ کہ بعض عادات بھی عرب ماحول ہی کی مناسبت سے آپ ﷺ کی شخصیت میں جگہ بنا پائیں۔ دوسری جہت یوں کہہ لیجیے کہ انسان کے لیے 'مثالیے' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پہلو پر آپ ﷺ کی شخصیت میں عمومی بشری ساخت کی تکمیل ہوئی۔ عمومی بشریت سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفس اور اس کے مرغوبات و معمولات کا وہ حصّہ جو انسانوں میں بلا قیدِ زمان و مکان مشترک اور مستقل ہے۔ اس میں نفس فطرت کے موقف پر کھڑا ہو کر کچھ عادتیں اور چند رویّے اختیار کرتا ہے جن کا اظہار زندگی کی عام سطح اور پسند ناپسند کے بنیادی داعیات و جذبات کی کارفرمائی میں ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر رسول اللہ ﷺ کی تاریخی شخصیت کے خالص تہذیبی اور معاشرتی مظاہر میں سے اکثر اتباع کا موضوع نہیں ہیں' لیکن آپ ﷺ کے ماورائے تہذیبِ انسانی مظاہر دراصل اتباع کے حقیقی مقاصد ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ دراز گوش پر سوار ہوتے تھے' کھجور کی بعض اقسام کو پسند فرماتے تھے' عربی زبان بولتے تھے' ایک خاص ہیئت کے گھر میں رہتے تھے' کچھ جگہیں آپ ﷺ کو اچھی لگتی تھیں وغیرہ۔ یہ اتباع بمعنی نقل کا موضوع نہیں ہیں' جبکہ دوسری طرف آپ ﷺ عموماً سر ڈھانپتے تھے' ازار اونچا رکھتے تھے' کھانے کی کچھ ہیئتوں پر کاربند رہتے تھے' ہمیشہ دائیں کروٹ سوتے تھے اور اٹھتے تھے' خوشبو پسند فرماتے تھے' مزاجِ مبارک میں ظرافت بھی تھی' طبعاً کمالِ زہد ہی پر رہنا مرغوب تھا' بچوں سے محبّت فرماتے تھے' کشادہ رُو تھے وغیرہ۔ یہ تمام افعال و اعمال تقاضا کرتے ہیں کہ ہم ان کی اتباع کریں تاکہ بشریت کی مثالی ساخت حاصل کر سکیں' جو ہدایت میں ثابت قدم اور رو بکمال رہنے کے لیے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں سے کچھ باقاعدہ سنّتیں ہیں' ہم نے ایک مصلحت سے انہیں عادات و معمولات میں شمار کیا ہے۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے مزاجِ مبارک سے ہر نوع کی مناسبت پیدا کیے بغیر نہ انسانیت میں ترقّی ممکن ہے نہ ہی عبدیت میں کمال کا کوئی امکان۔ ہم اپنی گزارشات کا اختتام حضرت قاری محمد طیب صاحب قاسمی کے ایک اقتباس پر کریں گے۔ ''میلاد النّبی ﷺ کی حقیقت'' نامی مضمون میں فرماتے ہیں:

> ''حاصل یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے حقوق میں جو اُمّت پر عائد ہوتے ہیں تین حقوق بنیادی ہیں: محبّت' عظمت اور متابعت۔ اگر انسان عاشقِ رسولؐ ہے لیکن عظمت نہیں رکھتا تو وہ یقیناً اتلافِ حقوق کا مرتکب ہے۔ عظمت و بڑائی رکھتا ہے مگر محبّت نہیں رکھتا تو وہ بھی حق تلف ہے' اور اگر محبّت و عظمت رکھتا ہے مگر متابعت نہیں رکھتا تو وہ بھی حق تلف ہے۔ ادائے حقوق کی صورت اس کے سوا نہیں کہ حضور ﷺ کی محبّت و عظمت اور متابعت سے بیک وقت اس کا قلب و قالب منوّر ہو۔''

مِلاکُ التأوِیل (۲۳)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ الاعراف

(۱۳۷) **آیات ۸۴-۸۰:**

﴿وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾﴾

''اور (یاد کرو) لوط کو جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: تم بدکاری کرتے ہو ایسی کہ تم سے پہلے جہانوں میں کسی نے نہ کی تھی۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مَردوں سے شہوت رانی کرتے ہو؟ نہیں! تم لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہو۔ اس کی قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا: نکالو ان لوگوں کو اپنی بستی سے، یہ لوگ تو پاک بازی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، تو ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو بچا لیا سوائے اس کی بیوی کے جو کہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی، اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش کی۔ تو پھر دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیسے ہوتا ہے۔''

اور سورۃ النمل میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾﴾

''اور (یاد کرو) لوط کو جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بدکاری کرتے ہو حالانکہ تم دیکھتے بھالتے ہو؟ کیا

تم واقعی عورتوں کو چھوڑ کر مَردوں سے شہوت رانی کرتے ہو؟ نہیں! تم لوگ ایک جاہل قوم ہو! تو اُس کی قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا نکالو لوط کے آل اولاد کو اپنی بستی سے‘ یہ لوگ تو پاکبازی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ تو پھر ہم نے اُسے اور اس کے گھرانے کو بچا لیا سوائے اس کی بیوی کے‘ جسے ہم نے عذاب میں رہ جانے والوں میں مقدر کر رکھا تھا۔ اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش کی۔ تو پھر کیا ہی بھیانک تھی وہ بارش جو اُن لوگوں پر ہوئی جنہیں ڈرایا گیا تھا۔‘‘

اور پھر سورۃ العنکبوت کی آیات میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَي الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾﴾

’’اور (یاد کرو) لوط کو جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: تم یقیناً وہ بدکاری کرتے ہو کہ تم سے پہلے جہانوں میں کسی نے وہ نہ کی تھی‘ کیا تم مَردوں کے پاس (ہوس رانی کے لیے) آتے ہو اور پھر راہ زنی کرتے ہو اور اپنی محفلوں میں منکرات کا ارتکاب کرتے ہو؟ تو پھر اس کی قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا: اگر تم سچے ہو تو عذاب الٰہی کو لے آؤ۔ تو اُس نے کہا: اے میرے ربّ! مجھے ان مفسد لوگوں کے مقابلے میں مدد عطا فرما!‘‘

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قوموں کو مخاطب کرتے وقت موقع کی مناسبت سے اندازِ گفتگو اختیار کرتے ہیں‘ کبھی مقام مختلف ہوتا ہے‘ کبھی لوگ اور کبھی وقت‘ اس لیے ہر موقع پر اس کی مناسبت سے بات کی جاتی ہے۔ کبھی ساری قوم سے خطاب ہوتا ہے اور کبھی ان میں سے ایک مخصوص گروہ سے‘ کبھی اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی طوالت سے‘ اس لیے اختلافِ عبارت کسی اچنبھے کا باعث نہیں بننا چاہیے‘ البتہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ فلاں سورت میں یہ مضمون کسی خاص انداز میں کیوں بیان کیا گیا ہے جو کہ دوسری سورتوں سے مختلف ہے‘ اور یہی وہ نکات ہیں جو متذکرہ آیات کے بارے میں اٹھائے گئے ہیں۔ کُل سات سوالات بنتے ہیں‘ پہلے دو سوالوں کو لیتے ہیں:

(۱۔۲) سورۃ الاعراف اور سورۃ النمل میں کہا: ﴿اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ﴾ اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ﴾ اور پھر سورۃ الاعراف اور سورۃ العنکبوت میں ان کی یہ حالت بتائی گئی: ﴿مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ لیکن سورۃ النمل میں اس کی جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾﴾

جواباً عرض ہے کہ سورۃ الاعراف اور سورۃ النمل میں سوالیہ انداز اختیار کیا گیا ہے ﴿اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ؟﴾ یہ نہ صرف سوال ہے بلکہ ایک قسم کی ڈانٹ بھی۔ یہاں ملاحظہ ہو کہ سورۃ الاعراف میں چند پچھلی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے‘ جیسے قومِ نوح‘ قومِ ہود اور قومِ صالح‘ ان میں سے ہر قوم نے اپنے رسول کو جھٹلایا تھا‘ ان کی نافرمانی کی تھی‘ جس

کی وجہ سے وہ عذابِ الٰہی کا شکار ہوئی تھی‘ تو یہاں مناسب تھا کہ اس بات کا حوالہ دیا جاتا کہ تم سے پہلے یہ قومیں گزر چکی ہیں‘ اور ان کے یہ جرائم تھے جن کی پاداش میں اُن پر عذابِ الٰہی نازل ہوا‘ لیکن تم لوگ تو تمام حدیں پار کر چکے ہو۔ تم نے تو وہ جرم کیا ہے جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔

سورۃ النمل میں ﴿وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ کا لاحقہ ہے‘ یعنی تم بدکاری کرتے ہو کہ جس کی بُرائی اور شناعت ہر ذی عقل شخص اپنی بصارت سے دیکھ سکتا ہے۔ اور اسے ان معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے کہ تم لوگ اپنی بدکاری میں اس حد تک بڑھ چکے ہو کہ یہ کام علی الاعلان کرتے ہو‘ تم میں تو اتنی بھی شرم نہ رہی کہ ذرا چھپ چھپا کر ہی کرتے!!

اس لحاظ سے ﴿وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ کہنا بھی مناسب تھا‘ تاکہ مزید شرم دلائی جائے۔ ایک وجہ مناسبت اور بھی ہے کہ اس سورت میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے‘ جہاں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰيٰتُنَا مُبۡصِرَةً﴾ (آیت ۱۳) ’’جب اُن کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں آئیں‘‘۔ یعنی ایسی نشانیاں جو قابلِ مشاہدہ تھیں۔ تو یہاں بھی یہی الفاظ لائے گئے‘ اور اس کے بعد ﴿بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ کہہ کر اس بات کو مزید واضح کر دیا گیا کہ اوّل تو تم لوگ عقل و بصارت کھو بیٹھے ہو کہ ایسا بدترین کام کرتے ہو‘ تو نہ تم میں عقل رہی اور نہ ہی بصارت‘ تو پھر تم جاہل نہیں تو اور کیا ہو؟

اب صرف اس سوال کا جواب رہ جاتا ہے کہ سورۃ العنکبوت میں ’’اِنَّ‘‘ اور ’’لام‘‘ کے ساتھ تاکیدی انداز اختیار کیا گیا ہے ﴿اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ﴾ اور ﴿اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ﴾۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب پچھلی دو سورتوں میں اس قصے کے بیان کے ضمن میں انہیں سرزنش کیے جانے اور انہیں ڈانٹ پلانے کا بار بار ذکر ہو گیا تو یہاں وہ اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا جسے قسمیہ کہا جاتا ہے‘ یعنی ’’اِنَّ‘‘ اور ’’لام‘‘ یہاں وہی تاکید کا حق ادا کر رہے ہیں جو قسم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سورتوں کی ترتیب کے تناظر میں یہ اسلوبِ بیان بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ سورۃ الاعراف اور سورۃ النمل میں کہا گیا:

﴿اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ﴾

یعنی تم لوگوں نے اپنے اس بُرے فعل میں صرف شہوت کا خیال رکھا‘ نہ کہ شریعت کے اس بلند و بالا مقصد کا کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ جاری رہے اور یہ وہ مقصد ہے جو جانوروں میں بھی بطور جبلت پایا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں سورتوں کی آیات کا اختتام دو مختلف عبارتوں سے ہوتا ہے۔ پہلی سورت میں ارشاد فرمایا: ﴿بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾ اور دوسری سورت میں ارشاد فرمایا: ﴿بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾

سورۃ العنکبوت میں ﴿شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ﴾ کے الفاظ نہیں ہیں‘ اور اس کے بجائے ان کے دو مزید منکر افعال کا تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَتَقۡطَعُوۡنَ السَّبِيۡلَ ۙ وَتَاۡتُوۡنَ فِىۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ ؕ﴾ تو اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۃ الاعراف میں ان کی فحش ترین حرکت کا ذکر ہے' لیکن چونکہ انہوں نے کئی دوسرے جرائم بھی کیے تھے جن کا تذکرہ سورۃ العنکبوت میں آ رہا ہے' تو آخر میں کہا گیا: ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ تاکہ جرم کے باب میں ان کے اسراف کا ذکر آ جائے۔ اور چونکہ سورۃ النمل میں انہیں یہ ڈانٹ پلائی گئی تھی کہ تم دیکھتے بھالتے کے باوجود یہ انتہائی پست ترین حرکت کرتے ہو تو معلوم ہوا کہ تم نے اپنی بصارت اور بصیرت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا' اس لیے ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾ کا مصداق بننے کے قابل ہو۔ اور پھر سورۃ العنکبوت میں اس اسراف کو کھول کر بیان کر دیا گیا جس کی طرف سورۃ الاعراف میں اشارہ کیا گیا تھا۔ فرمایا: ﴿وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ﴾ یعنی بدکاری کے ساتھ ساتھ تم راہ زنی بھی کرتے رہے ہو اور اپنی محفلوں میں منکرات کا بھی ارتکاب کرتے رہے ہو؟

اور اگر ان سورتوں کو ترتیب وار ملاحظہ کریں تو معلوم ہوگا کہ پہلی سورۃ (الاعراف) میں ان کی بدترین حرکت کا ذکر کیا گیا اور باقی بدحرکات کی طرف صرف اشارہ کیا گیا۔ دوسری سورۃ (النمل) میں اس فعل کی شناعت یوں ظاہر کی گئی کہ بصارت اور بصیرت اس سے اباء کرتی ہے اور تیسری سورت (العنکبوت) میں ان کی بقیہ بداعمالیوں کا بھی بیان ہو گیا کہ کلام میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ واللہ اعلم!

(۴) چوتھا سوال یہ ہے کہ تینوں سورتوں میں قومِ لوط کا جواب مختلف انداز میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝﴾ سورۃ النمل میں: ﴿اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ .....﴾ کے الفاظ ہیں۔ اور سورۃ العنکبوت میں ﴿قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾ کے الفاظ ہیں' تو اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟

ملاحظہ فرمائیں کہ سورۃ النمل میں چونکہ قومِ لوط کو ڈانٹ پلانے میں شدت آ چکی تھی کہ تم لوگ آنکھوں سے دیکھتے ہو اور پھر بھی ایسے شنیع افعال کرتے ہو تو قومِ لوط نے بھی اپنے جواب میں صرف ﴿اَخْرِجُوْهُمْ﴾ کہنے پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ خاص طور پر ﴿اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ﴾ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی' یعنی لوط علیہ السلام کے سارے گھرانے کو باہر نکال پھینکو کہ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا پاکباز سمجھتے ہیں۔ اور سورۃ العنکبوت میں جب ان کے باقی تمام گھناؤنے جرائم کا ذکر بھی آ گیا کہ نہ صرف تم اغلام بازی کرتے ہو بلکہ راہ زنی کے بھی مرتکب ہو تو ان کا بھڑک جانا ضروری تھا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ توبہ و استغفار کرتے' وہ مقابلے پر اتر آئے کہ اچھا اگر ایسی بات ہے تو کر لو جو کر سکتے ہو' جس عذاب کا ڈراوا دے رہے ہو اُس عذاب کو لے آؤ اگر تم سچے ہو''۔ واللہ اعلم!

(۵) لوط علیہ السلام کی بیوی کے انجام کے بارے میں عبارت کا اختلاف ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا: ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾﴾ اور سورۃ النمل میں ﴿قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾﴾ کے الفاظ سے ذکر کیا اور سورۃ الحجر میں بھی ﴿قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾﴾ کے الفاظ ہیں۔ اور سورۃ العنکبوت کی آیت ۳۲ میں ﴿كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝﴾ کے الفاظ ہیں۔

اس اختلافِ عبارت کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ یہاں وہی اصول کارفرما ہے جس کا ہم پہلے متعدد بار تذکرہ کر چکے ہیں کہ اگر بیان میں اختصار ہو تو الفاظ کم لائے جاتے ہیں‘ جہاں طوالت ہو وہاں زیادہ لائے جاتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں قومِ لوط کی طرف سے صرف ﴿اَخْرِجُوْهُمْ﴾ کہا گیا تھا تو اُن کی بیوی کے بارے میں صرف ﴿كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۸۳﴾ کہا گیا۔ سورۃ النمل میں قومِ لوط نے ﴿اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ﴾ کہا تھا تو جواباً یہاں ﴿قَدَّرْنٰهَا﴾ کہہ کر الفاظ میں شدت کا اظہار کیا گیا۔ اور سورۃ الحجر میں ان الفاظ کے ساتھ مزید تاکید ہے: ﴿قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۶۰﴾ یعنی ’’اِنَّ‘‘ کا تاکیدی لفظ بھی شامل ہے‘ اور وہ اس لیے کہ اس سورت میں اس آیت سے قبل دو آیتیں وارد ہوئی ہیں جن میں ’’اِنَّا‘‘ کے ساتھ تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝۵۸﴾ ’’انہوں نے کہا کہ ہم بے شک بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف‘‘۔ ﴿اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۵۹﴾ ’’مگر لوط کے گھر والے‘ ہم ان سب کو بچا لیں گے‘‘۔ اور پھر متذکرہ آیت آتی ہے: ﴿اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۭ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۶۰﴾ ’’سوائے اُس کی بیوی کے‘ ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ بے شک پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔‘‘

(اور سورۃ العنکبوت میں تو سرے سے قومِ لوط کا یہ قول موجود ہی نہیں کہ ان سب لوگوں کو یا آلِ لوط کو باہر پھینک ڈالو‘ تو وہاں ﴿كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۲﴾ کہنے پر اکتفا کرنا مناسب تھا۔ (مترجم)

(۶) چھٹا سوال یہ ہے کہ عقوبتِ الٰہی کے بارے میں الفاظ کا اختلاف یوں ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۸۴﴾ اور سورۃ النمل میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۵۸﴾۔

بطورِ وضاحت عرض کیے دیتے ہیں کہ سورۃ الاعراف میں پہلے تو ان پر سنگ ریزی کی بارش برسانے کا ذکر کیا اور پھر کہا کہ دیکھو! مجرموں کا انجام کیسے ہوتا ہے‘ اور وہ اس لیے کہ اس سے قبل ان کے جرم کی شناعت کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ تمام عالم میں تم سے پہلے کسی نے ایسی قبیح چیز کا ارتکاب نہیں کیا تھا‘ تو مناسب تھا کہ یہ کہا جاتا کہ دیکھو! مجرموں کا انجام کیسے ہوتا ہے؟

سورۃ النمل میں ﴿وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۵۵﴾ کہہ کر ان کی مزید کھنچائی کی گئی ہے کہ تم دیکھتے بھالتے ہو کر ایسا کام کرتے ہو تو پھر مناسب تھا کہ یہ کہا جاتا کہ: ﴿فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۵۸﴾ ’’کیا ہی بُری ہے وہ بارش جو ان لوگوں پر برسائی گئی جنہیں پہلے ڈراوا دیا گیا تھا۔‘‘

(۷) سورۃ الاعراف میں واوِ عطف لایا گیا: ﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ﴾ اور باقی دونوں سورتوں میں فاءِ عطف لایا گیا: ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ﴾ اس کا جواب یہ ہے کہ فاء عطف وہاں لایا جاتا ہے جہاں اس سے قبل کوئی سبب بیان ہوا ہو یا ایسی کوئی چیز جو سبب کا قائم مقام بن سکے۔ پہلی بات کے لیے یہ تین مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶﴾ (الاعلیٰ)

''ہم تمہیں پڑھوا دیں گے تو تم نہ بھول پاؤ گے۔''

(۲) ﴿فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

''پس وہ ایمان لے آئے تو ہم نے انہیں ایک مدت کے لیے اور موقع دیا۔''

(۳) ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ﴾ (الاعراف:۶۴)

''تو انہوں نے اُس (نوح علیہ السلام) کو جھٹلایا تو ہم نے اُسے نجات دی۔''

بہرحال اس ضمن میں بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ دوسری بات کے لیے یہ دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

(۱) ﴿وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾﴾ (الاسراء)

''اور ہم انہیں ڈراتے ہیں تو یہ انہیں مزید سرکشی کرنے پر اُبھارتا ہے۔''

(۲) ﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۙ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ (الاحقاف:۲۶)

''اور ہم نے ان کے لیے سمع و بصر اور دل بنائے' لیکن اُن کا سننا یا دیکھنا یا اُن کے دل ان کے کچھ بھی کام نہ آئے۔''

اب دیکھئے کہ سورۃ النمل میں ﴿اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾﴾ کہہ کر یہ بتلایا گیا تھا کہ ہم نے تمہیں فہم و تدبر کے لیے آنکھیں دی تھیں کہ جن سے چیزوں کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے' ایسی حرکتوں سے کہ جن سے عار آئے' حیا کی تلقین ملتی ہے اور پھر ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾ کہہ کر ان کی جہالت اور نادانی کا بھی تذکرہ کیا گیا' تو مناسب تھا کہ یہاں پر فاء سبب لایا جاتا۔

سورۃ الاعراف میں ﴿وَمَا كَانَ﴾ سے قبل جو الفاظ کہے گئے ہیں وہ سبب کے اعتبار سے باقی دونوں سورتوں کی عبارات کے ہم پلّہ نہیں ہیں۔ یہاں اس سے قبل ﴿مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾﴾ اور ﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس لیے بجائے فاء السبب کے واو العطف کو لایا گیا۔ سورۃ العنکبوت کی آیت میں سبب کا ذکر بہت واضح ہے۔ دیکھئے: ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ﴾ سے قبل ان کے تین افعالِ شنیعہ کا بیان ہوا' یعنی ان کی شہوت رانی کا' راہ زنی کا اور محفلوں میں منکرات کے ارتکاب کا' اور یہ سب کے سب اسباب ہیں' اس لیے فاء السبب کا لایا جانا بالکل مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

(۱۳۸) آیت ۸۵:

﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾

''اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)' اُس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو' تمہارے لیے سوائے اُس کے اور کوئی معبود نہیں۔''

اور سورۂ ہود میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾

(آیت ۸۴)

''اور مدین کی طرف (ہم نے بھیجا) ان کے بھائی شعیبؑ کو۔ اُس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، تمہارا کوئی معبود نہیں اُس کے سوا۔''

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ.....﴾ (آیت ۳۶)

''اور مدین کی طرف بھیجا ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو تو اُس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو''

سوال یہ ہے کہ ان تینوں یکساں مضمون کی آیات میں صرف سورۃ العنکبوت میں ''فَقَالَ'' (فاء کے ساتھ) کہا گیا جبکہ باقی دونوں سورتوں میں صرف ''قَالَ'' کہا گیا؟

ملاحظہ ہو کہ سورۃ الاعراف میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا بیان ہے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (آیت ۵۹) یہاں بھیجے جانے کا ذکر ہے (اَرْسَلْنَا) تو اس کے بعد ''فَقَالَ'' کہا گیا، لیکن اس کے بعد جن انبیاء کا ذکر ہے وہاں ''اَرْسَلْنَا'' کا اعادہ نہیں کیا گیا اور اس کے نتیجے میں ''فاء'' بھی نہیں لایا گیا۔ ملاحظہ ہو: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (آیت ۶۵) ﴿وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (آیت ۷۳) ﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (آیت ۸۵) اور بالکل ایسے ہی سورۃ ہود میں ان تینوں انبیاء کا ذکر اسی طرز پر ہے: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (آیت ۵۰) ﴿وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (آیت ۶۱) ﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (آیت ۸۴)

اب آیئے سورۃ العنکبوت کی طرف جہاں پہلے نوح علیہ السلام کا تذکرہ آیا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْھِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا﴾ (آیت ۱۴) اور چونکہ اس سورت میں اسی طرز پر کسی دوسرے رسول کا ذکر نہیں ہے، اس لیے جب شعیب علیہ السلام کا ذکر ﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا﴾ (آیت ۳۶) کے الفاظ کے ساتھ آیا تو اس آیت کو پچھلی آیت سے جوڑنا مناسب ہوگا، یا دوسرے الفاظ میں یہ آیت پچھلی آیت پر معطوف ہے۔ وہاں ''ارسلنا'' کے الفاظ صراحتاً مذکور تھے، اس لیے ''فَلَبِثَ'' کا لفظ فاء کے ساتھ لایا گیا۔ یہاں ''اَرْسَلْنَا'' مقدر ہے، اس لیے ''فَقَالَ'' فاء کے ساتھ لایا گیا، تاکہ دونوں آیات میں لفظی مناسبت ظاہر ہو جائے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورۃ العنکبوت میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کے بعد دو انبیاء کا ذکر ہے، تو اس سورت کے بیانیہ میں اور سورۃ الاعراف اور سورۃ ہود کے بیانیہ میں کیا فرق ہوا؟ تو ہم کہیں گے کہ دونوں انبیاء کا ذکر ان

الفاظ کے ساتھ آیا ہے :﴿وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ﴾ (آیت ۱۶)﴿وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ﴾ (آیت ۲۸)۔ یہاں باقی دونوں سورتوں کی طرح ''اِلٰی'' کا حرف غایت استعمال نہیں ہوا۔ ''اِذْ قَالَ'' کا مفہوم یہ ہے کہ یاد کرو جب اُس نے کہا! گویا ان دونوں آیات کا عطف ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ﴾ پر نہیں ہوسکتا' جبکہ ﴿وَاِلٰی مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا﴾ کا عطف اس آیت پر ہوسکتا ہے کہ اس میں ''اِلٰی'' حرف غایت موجود ہے اور ''اَرْسَلْنَا'' مقدر ہے۔ اس کے مقابلے میں سورۃ الاعراف اور سورۃ ہود میں تمام انبیاء کا ذکر ایک ہی طرز پر ہے۔ اس لیے ہم نے کہا کہ وہاں پہلی آیت میں ''اَرْسَلْنَا'' اور اس کے جواب میں ''فَقَالَ'' کہا گیا اور بقیہ انبیاء کے ذکر میں ''اَرْسَلْنَا'' محذوف کر دیا گیا تو پھر ''فاء'' کی تکرار بھی نہیں کی گئی۔ واللہ اعلم!

(۱۳۹) آیت ۱۰۱:

﴿تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾

''یہ وہ بستیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ کو بتا رہے ہیں' اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے' تو وہ نہیں تھے ایمان لانے والے ان باتوں پر جن کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔''

اور سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾﴾

''اور پھر اس کے بعد ہم نے رسول بھیجے اپنی اپنی قوم کی طرف' تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے' تو وہ نہیں تھے ایمان لانے والے ان باتوں پر جنہیں وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اور ہم اسی طرح سرکشی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔''

اور اسی سورت کی ابتداء میں بھی ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾﴾

''اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں ہلاک کی ہیں جب کہ انہوں نے ظلم کیا تھا' اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے' اور وہ نہیں تھے ایمان لانے والے۔ اور اسی طرح ہم مجرم قوم کو بدلہ دیتے ہیں۔''

یہاں چار سوال ابھرتے ہیں:

(۱) سورۃ یونس کی آیت ۷۴ میں ﴿بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ﴾ ارشاد فرمایا' یعنی كَذَّبُوْا کے ساتھ ضمیر مجرور (بِهٖ) بھی

ہے، جو باقی دو آیات میں نہیں لائی گئی۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲) سورۃ الاعراف میں مہر لگانے کی نسبت لفظ جلالہ (اللہ) کی طرف کی گئی ہے جب کہ سورۃ یونس میں اسم ظاہر نہیں لایا گیا بلکہ ضمیر جمع متکلم (نَطْبَعُ) لائی گئی تو اس کی کیا وجہ ہے؟

(۳) سورۃ الاعراف میں کہا کہ کافروں کے دل پر مہر لگائی جاتی ہے اور سورۃ یونس میں اس کی جگہ مُعْتَدِيْنَ (سرکشی کرنے والوں) کا ذکر کیا گیا؟

(۴) سورۃ یونس کی آیت ۱۳ میں ان دونوں سورتوں کے ان آخری الفاظ سے صرف نظر کرتے ہوئے کہا: ﴿كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۳﴾ تو اس کا کیا سبب ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الاعراف کی آیت سے قبل دو آیات ملاحظہ فرمائیں: ﴿.....وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ﴾ (الاعراف:۸۶) ''.....اور تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اس کو جو اس پر ایمان لاتا ہے''۔ ﴿وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا.....﴾ (الاعراف:۸۷) ''اگر چہ تم میں سے ایک گروہ اس پر ایمان لے آیا تھا جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا اور وہاں ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو ایمان نہیں لایا''۔ اور اس کے بعد فرمایا: ﴿فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا .....﴾ ''تو پھر وہ ایمان لانے والے نہ تھے، اس لیے کہ انہوں نے جھٹلایا تھا.....'' کیا جھٹلایا تھا؟ ﴿بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ﴾ ''وہ جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا تھا'' تو یہاں ﴿بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ﴾ کی تکرار نہیں کی گئی بلکہ چونکہ یہ الفاظ پہلے آ چکے تھے، اس لیے دوبارہ انہیں نہیں لایا گیا۔ اور یہ بالکل ویسے ہی ہے، جیسے کہا: ﴿وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا﴾ ''اور وہاں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ایمان نہیں لایا''۔ کس چیز پر ایمان نہیں لایا؟ یعنی اس چیز پر جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا تھا ﴿بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ﴾ یہاں بھی یہ عبارت نہیں لائی گئی کہ وہ قابل فہم تھی۔ البتہ سورۃ یونس میں چونکہ پہلے ایسی کوئی تفصیل ذکر نہیں کی گئی تھی اس لیے وہاں ضمیر (بِهٖ) کے ساتھ لانا ضروری تھا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: ﴿فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ (آیت ۷۴)

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ یونس کی ابتداء میں چونکہ اللہ تعالیٰ نے ''بَعَثْنَا'' کہہ کر اپنی طرف بعثت کی نسبت کی تھی، اس لیے آیت کے آخر میں ''كَذٰلِكَ نَطْبَعُ'' کہہ کر مہر لگانے کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ سورۃ الاعراف میں ایسی کسی نسبت کا ذکر نہیں تھا، صرف رسولوں کے اپنی اقوام کی طرف آنے کا ذکر تھا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ﴾ اس لیے وہاں اللہ تعالیٰ کا نام صریحاً لایا گیا، ضمیر متکلم نہیں لائی گئی۔ ارشاد فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۰۱﴾

تیسرے سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سورۃ الاعراف میں جہاں پچھلی قوموں کے احوال بیان ہوئے ہیں، وہاں ان قوموں کے جوابات بھی بیان ہوئے ہیں، جن میں مثال کے طور پر قوم صالح کا یہ جواب ملاحظہ ہو: ﴿اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۷۶﴾ ''تو جس پر تم ایمان لائے ہو ہم اُس کا انکار کرتے ہیں''۔ قومِ شعیب کا

یہ بیان ذکر کیا گیا ہے: ﴿لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝۹۰﴾ ''اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تب تو تم لازماً خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے''۔ اس مناسبت سے آخر میں کہا: ﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۰۱﴾۔ سورۂ یونس میں طرزِ خطاب ایسے نہیں ہے جیسے سورۃ الاعراف میں ہے۔ صرف نوح علیہ السلام کا ذکر ہوا اور پھر عمومی طور پر رسولوں کے بھیجے جانے کا ذکر ہوا' اس لیے یہاں بجائے ''كٰفِرِيْنَ'' کے ''مُعْتَدِيْنَ'' کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔

(اضافہ از مترجم: اس سے بہتر تھا کہ یہ کہا جائے کہ یہاں دلوں پر مہر لگائے جانے کا ذکر ہے' تو یہاں سُنّتِ الٰہی کا بیان ہو رہا ہے کہ یہ مہر نہ صرف کفّار کے دلوں پر لگائی جاتی ہے بلکہ کفر کے ہم پلہ کردار جیسے سرکشی (یعنی اعتداء) پر بھی لگائی جاتی ہے۔ اس لیے سورۃ الاعراف میں ''كٰفِرِيْنَ'' کا تذکرہ ہو گیا اور سورۃ یونس میں ''مُعْتَدِيْنَ'' کا)

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۂ یونس کی آیت (۱۳) میں مجرم قوم سے بدلہ لینے کا ذکر ہے' اور یہ اس لیے کہ اس آیت سے قبل خصوصی طور پر کسی بھی قوم کا ذکر نہیں آیا' بطورِ عبرت یہ کہا گیا تھا کہ: ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا﴾ ''اور ہم نے تم سے پہلے کئی قوموں کو ہلاک کیا تھا جب کہ انہوں نے ظلم کیا''، تو ظلم کے مقابلے میں ﴿الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ کے الفاظ لائے گئے۔ اس لفظ سے دونوں باتوں کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے' یعنی انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور پھر ان کا انکار بھی کیا۔ واللہ اعلم!

❁❁❁

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ: 14) ''اور نماز قائم کرو میری یاد کے لیے!''

فلسفۂ دین کی رُو سے
طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے

نماز کی خصوصی اہمیّت

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کے دو (2) فکر انگیز اور بصیرت افروز خطابات

o امپورٹڈ بک پیپر o عمدہ طباعت o خوبصورت ٹائٹل
o صفحات: 56 o قیمت: 60 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور، 36 کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور، 3-35869501-042

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃ یُونس

آیات ۳۱ تا ۴۰

﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ
الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى
تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ
هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ
اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ
تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ
تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ
يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ
كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ
بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾﴾

ترکیب

(آیت ۳۵) لَا یَھِدِّیْ دراصل لَا یَھْتَدِیْ ہے جو قاعدہ کے مطابق تبدیل ہو کر لَا یَھِدِّیْ استعمال ہوا ہے۔

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہیے
مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے
اَمَّنْ یَّمْلِكُ : یا کون اختیار رکھتا ہے
وَالْاَبْصَارَ : اور بصارتوں پر
الْحَیَّ : زندہ کو
وَیُخْرِجُ : اور (کون) نکالتا ہے
مِنَ الْحَیِّ : زندہ سے
الْاَمْرَ : تمام معاملات کی
فَقُلْ : تو آپؐ کہیں
فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ : پس یہ اللہ ہے
فَمَاذَا : پھر کیا ہے
اِلَّا الضَّلٰلُ : سوائے گمراہی کے
تُصْرَفُوْنَ : تم لوگ پھیرے جاتے ہو
حَقَّتْ : حق ہوا
عَلَى الَّذِیْنَ : اُن لوگوں پر جنہوں نے
اَنَّهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ : کہ وہ لوگ ایمان نہیں لاتے
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ : تمہارے شریکوں میں سے
الْخَلْقَ : پیدا کرنے کی
قُلِ اللّٰهُ : آپؐ کہیے اللہ
الْخَلْقَ : پیدا کرنے کی
فَاَنّٰى : تو کہاں سے
قُلْ هَلْ : آپؐ کہیے کیا
مَّنْ یَّهْدِیْٓ : کوئی ہدایت دیتا ہے

مَنْ یَّرْزُقُكُمْ : کون رزق دیتا ہے تم کو
وَالْاَرْضِ : اور زمین سے
السَّمْعَ : سماعت پر
وَمَنْ یُّخْرِجُ : اور کون نکالتا ہے
مِنَ الْمَیِّتِ : مُردہ سے
الْمَیِّتَ : مُردہ کو
وَمَنْ یُّدَبِّرُ : اور کون تدبیر کرتا ہے
فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ : تو وہ کہیں گے کہ اللہ
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ : تو کیا تم لوگ ڈرتے نہیں
رَبُّكُمُ الْحَقُّ : جو تمہارا حقیقی پرورش کرنے والا ہے
بَعْدَ الْحَقِّ : حق کے بعد
فَاَنّٰى : تو کہاں سے
كَذٰلِكَ : اس طرح
كَلِمَتُ رَبِّكَ : آپؐ کے ربّ کا فرمان
فَسَقُوْٓا : نافرمانی کی
قُلْ هَلْ : آپؐ کہیے کیا
مَّنْ یَّبْدَؤُا : کوئی ابتدا کرتا ہے
ثُمَّ یُعِیْدُهٗ : پھر واپس لاتا ہے اس کو
یَبْدَؤُا : ابتدا کرتا ہے
ثُمَّ یُعِیْدُهٗ : پھر وہ واپس لاتا ہے اس کو
تُؤْفَكُوْنَ : تم لوگ لوٹائے جاتے ہو
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ : تمہارے شریکوں میں سے
اِلَى الْحَقِّ : حق کی طرف

قُلِ اللّٰہُ : آپؐ کہیے اللہ
لِلْحَقِّ : حق کے لیے
اِلَی الْحَقِّ : حق کی طرف
اَنْ یُّتَّبَعَ : کہ اُس کی پیروی کی جائے
لَّا یَھِدِّیْٓ : ہدایت نہیں پاتا
یُّھْدٰی : اُس کو ہدایت دی جائے
کَیْفَ : کیسا
وَمَا یَتَّبِعُ : اور پیروی نہیں کرتے
اِلَّا ظَنًّا : مگر گمان کی
لَا یُغْنِیْ : بے پرواہ نہیں کرتا
شَیْئًا : کچھ بھی
عَلِیْمٌ : جاننے والا ہے
وَمَا کَانَ : اور نہیں ہے
اَنْ یُّفْتَرٰی : کہ اس کو گھڑا جائے
وَلٰکِنْ : اور لیکن (یعنی بلکہ)
بَیْنَ یَدَیْہِ : اس سے پہلے ہے

لَا رَیْبَ : کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے
مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ : تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے (ہونے میں)
افْتَرٰہُ : اس نے گھڑا اس کو
بِسُوْرَۃٍ : ایک سورت
وَادْعُوْا : اور بلالو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ : اللہ کے علاوہ
صٰدِقِیْنَ : سچ کہنے والے
بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا : اُس کو جس کا انہوں نے احاطہ نہیں کیا

یَھِدِّیْ : ہدایت دیتا ہے
اَفَمَنْ یَّھِدِّیْٓ : تو کیا وہ جو ہدایت دیتا ہے
اَحَقُّ : زیادہ حق دار ہے
اَمَّنْ : یا اُس کی جو
اِلَّآ اَنْ : سوائے اس کے کہ
فَمَا لَکُمْ : تو کیا ہے تمہیں
تَحْکُمُوْنَ : تم لوگ حکم لگاتے ہو
اَکْثَرُھُمْ : ان کے اکثر
اِنَّ الظَّنَّ : بے شک گمان
مِنَ الْحَقِّ : حق سے
اِنَّ اللّٰہَ : بے شک اللہ
بِمَا یَفْعَلُوْنَ : اُس کو جو وہ کرتے ہیں
ھٰذَا الْقُرْاٰنُ : یہ قرآن
مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ : اللہ کے علاوہ (کسی) سے
تَصْدِیْقَ الَّذِیْ : اُس کی تصدیق کرتا ہے جو
وَتَفْصِیْلَ الْکِتٰبِ : اور تمام فرائض کو کھول کر بیان کرتا ہے
فِیْہِ : جس میں
اَمْ یَقُوْلُوْنَ : یا وہ لوگ کہتے ہیں

قُلْ فَاْتُوْا : آپؐ کہیے تو تم لوگ لاؤ
مِّثْلِہٖ : اس کے جیسی
مَنِ اسْتَطَعْتُمْ : اُس کو جس کی تمہیں استطاعت ہے
اِنْ کُنْتُمْ : اگر تم لوگ ہو
بَلْ کَذَّبُوْا : بلکہ انہوں نے جھٹلایا
بِعِلْمِہٖ : اُس کے علم سے

وَلَمَّا يَأْتِهِمْ: اور ابھی تک نہیں پہنچا ان کے پاس	تَأْوِيلُهُ: اس کا انجام کار
كَذٰلِكَ: اسی طرح	كَذَّبَ: جھٹلایا
الَّذِيْنَ: انہوں نے جو	مِنْ قَبْلِهِمْ: ان سے پہلے تھے
فَانْظُرْ: تو آپؐ دیکھیں	كَيْفَ كَانَ: کیا تھا
عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ: ظلم کرنے والوں کا انجام	وَمِنْهُمْ مَّنْ: اور ان میں وہ بھی ہیں جو
يُؤْمِنُ بِهٖ: ایمان لاتے ہیں اس پر	وَمِنْهُمْ مَّنْ: اور ان میں وہ بھی ہیں جو
لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ: ایمان نہیں لاتے اس پر	وَرَبُّكَ: اور آپؐ کا رب
اَعْلَمُ: سب سے زیادہ جاننے والا ہے	بِالْمُفْسِدِيْنَ: فساد پھیلانے والوں کو

نوٹ ۱: آیت ۳۲ میں تُصْرَفُوْنَ اور آیت ۵۳ میں تُؤْفَكُوْنَ یہ دونوں مضارع مجہول ہیں‘ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ کہاں سے تم لوگ لوٹ جاتے ہو؟ بلکہ یہ کہا ہے کہ تم لوگوں کو لوٹایا جاتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گمراہ کرنے والا کوئی شخص یا گروہ ہوتا ہے جو لوگوں کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ پر پھیر دیتا ہے۔ اسی بنا پر لوگوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو؟ اپنی عقل کیوں نہیں استعمال کرتے؟ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: آیت ۳۵ میں جو سوال کیا گیا ہے وہ بہت اہم ہے‘ اس لیے اس کو وضاحت سے سمجھ لیں۔ اس دنیا میں انسان کی ضرورتوں کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ اس کو زندگی بسر کرنے کا سامان ملتا رہے اور وہ آفات و مصائب سے محفوظ رہے‘ بلکہ اس کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو۔ وہ جانے کہ اپنی ذات کے ساتھ‘ اس سروسامان کے ساتھ جو اُس کے تصرف میں ہے‘ ان انسانوں کے ساتھ جن سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے‘ وہ کیا اور کس طرح کا معاملہ کرے جس سے اس کی زندگی کامیاب ہو اور اس کی کوشش اور محنت غلط راہوں پر صرف ہو کر تباہی و بربادی پر منتج نہ ہو۔ اسی صحیح طریقے کا نام حق ہے۔ اب قرآن مجید ان سب لوگوں سے پوچھتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو ان میں کوئی ہے جو تمہارے لیے ہدایتِ حق کا ذریعہ بنتا ہو یا بن سکتا ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کیوں؟ اس کی وجہ بھی سمجھ لیں۔

انسان اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتا ہے ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ دیوی‘ دیوتا اور زندہ یا مُردہ انسان جن کی طرف انسان کا رجوع صرف اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ فوق الفطری طریقے سے وہ اس کی حاجتیں پوری کریں اور اُس کو آفات سے بچائیں۔ کبھی کسی مشرک نے ہدایتِ حق کے لیے ان کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اور نہ کوئی مشرک یہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معبود اُسے معاشرت‘ تمدن‘ سیاست‘ اخلاق‘ عدالت وغیرہ کے اصول سکھاتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر وہ انسان ہیں جن کے بنائے ہوئے اصولوں اور قوانین کی پیروی اور اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ لوگ رہنما تو ضرور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ رہنمائے حق بھی ہیں؟ کیا ان میں سے کسی کا بھی علم ان

تمام حقائق پر حاوی ہے جن کا جاننا انسانی زندگی کے صحیح اصول وضع کرنے کے لیے ضروری ہے؟ کیا ان میں سے کوئی بھی ان کمزوریوں' تعصّبات' طبعی میلانات و رجحانات وغیرہ سے بالاتر ہے جو انسانی معاشرے کے لیے منصفانہ قوانین بنانے میں مانع ہوتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر یہ لوگ ہدایت کا سرچشمہ کیسے ہو سکتے ہیں؟

اسی بنا پر قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ لوگو! تمہارے ان مذہبی معبودوں اور تمدنی خداؤں میں کوئی ایسا بھی ہے جو تمہاری رہنمائی کرنے والا ہو؟ آیات ۳۱ تا ۳۴ کے سوالات سے مل کر آیت ۳۵ کا آخری سوال مذہب اور دین کے پورے مسئلے کا فیصلہ کرتا ہے۔

انسان کی ساری ضرورتیں دو ہی نوعیت کی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی اس کا پروردگار ہو' جو دعاؤں کا سننے والا اور حاجتوں کا پورا کرنے والا ہو۔ اس کے لیے قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ کوئی ایسا رہنما ہو جو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے اصول بتائے۔ اس کے لیے بھی قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ بھی صرف اللہ کا ہی کام ہے۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۴۱ تا ۶۰

﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِىْ وَرَبِّىْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾
هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ
وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ
تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ
فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

ترکیب: (آیت ۴۵) كَاَنْ لَّمْ میں كَاَنْ دراصل كَاَنَّ ہے' آگے لَمْ سے ملانے کے لیے نونِ خفیفہ ہوا ہے۔ (آیت ۴۶) اِمَّا میں اِنْ شرطیہ اور مَا زائدہ ہے۔ (آیت ۵۰) بَيَاتًا کو ظرف بھی مانا جا سکتا ہے لیکن بہتر ہے کہ اس کو حال مانا جائے' جبکہ نَهَارًا ظرف ہے۔ (آیت ۵۲) ثُمَّ قِيْلَ گزشتہ آیت کے اِذَا سے تسلسل میں ہے' اس لیے اس کا ترجمہ بھی مستقبل میں ہوگا۔ (آیت ۵۳) اَحَقٌّ هُوَ میں حَقٌّ خبر مقدم اور هُوَ مبتدأ مؤخر ہے۔ اِیْ عربی میں نَعَمْ کے معنی میں آتا ہے۔ وَرَبِّيْ کا واؤ قسمیہ ہے۔

ترجمہ:

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ: اور اگر وہ جھٹلاتے ہیں آپؐ کو	فَقُلْ: تو آپ کہہ دیجیے
لِيْ عَمَلِيْ: میرے لیے میرا عمل ہے	وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ: اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے
اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ: تم لوگ بَری ہو	مِمَّآ اَعْمَلُ: اُس سے جو میں عمل کرتا ہوں
وَاَنَا بَرِيْٓءٌ: اور میں بَری ہوں	مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ: اُس سے جو تم کرتے ہو
وَمِنْهُمْ مَّنْ: اور ان میں وہ بھی ہیں جو	يَّسْتَمِعُوْنَ: کان لگاتے ہیں
اِلَيْكَ: آپؐ کی طرف	اَفَاَنْتَ: تو کیا آپ
تُسْمِعُ الصُّمَّ: سنائیں گے بہروں کو	وَلَوْ: اس حال میں کہ اگرچہ
كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ: وہ عقل استعمال نہیں کرتے	وَمِنْهُمْ مَّنْ: اور ان میں وہ بھی ہیں جو
يَّنْظُرُ: دیکھتے ہیں	اِلَيْكَ: آپؐ کی طرف
اَفَاَنْتَ: تو کیا آپ	تَهْدِي الْعُمْيَ: راہ دکھائیں گے اندھوں کو
وَلَوْ: اس حال میں کہ اگرچہ	كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ: وہ کچھ بھی بصارت نہ رکھتے ہوں
اِنَّ اللّٰهَ: یقیناً اللہ	لَا يَظْلِمُ: ظلم نہیں کرتا
النَّاسَ: لوگوں پر	شَيْئًا: کچھ بھی

وَّلٰكِنَّ النَّاسَ : اور لیکن لوگ
يَظْلِمُوْنَ : ظلم کرتے ہیں
يَحْشُرُهُمْ : وہ اکٹھا کرے گا ان کو
اِلَّا سَاعَةً : مگر ایک گھڑی
يَتَعَارَفُوْنَ : ایک دوسرے کو پہچانیں گے
قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ : گھاٹے میں پڑ چکے ہیں وہ لوگ جنہوں نے
بِلِقَآءِ اللّٰهِ : اللہ کی ملاقات کو
مُهْتَدِيْنَ : ہدایت پانے والے
بَعْضَ الَّذِيْ : اُس کے بعض کو جو
اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ : یا ہم وفات بھی دیں آپؐ کو
مَرْجِعُهُمْ : لوٹنا ہے ان کو
شَهِيْدٌ : گواہ ہے
يَفْعَلُوْنَ : وہ کرتے ہیں
رَّسُوْلٌ : ایک رسول ہے
رَسُوْلُهُمْ : ان کا رسول
بَيْنَهُمْ : ان کے مابین
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ : اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا
مَتٰى : کب
اِنْ كُنْتُمْ : اگر تم لوگ ہو
قُلْ : آپؐ کہیے
لِنَفْسِيْ : اپنی جان کے لیے
وَّلَا نَفْعًا : اور نہ کسی نفع کا
شَآءَ اللّٰهُ : چاہے اللہ
اَجَلٌ : خاتمے کا ایک وقت ہے
اَجَلُهُمْ : ان کا وقت
سَاعَةً : ایک گھڑی

اَنْفُسَهُمْ : اپنے آپ پر
وَيَوْمَ : اور جس دن
كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا : گویا وہ ٹھہرے ہی نہیں
مِّنَ النَّهَارِ : دن میں سے
بَيْنَهُمْ : اپنے مابین
كَذَّبُوْا : جھٹلایا
وَمَا كَانُوْا : اور وہ نہیں تھے
وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ : اور اگر ہم دکھا ہی دیں آپؐ کو
نَعِدُهُمْ : ہم نے وعدہ کیا ان سے
فَاِلَيْنَا : تو ہماری طرف ہی
ثُمَّ اللّٰهُ : پھر اللہ
عَلٰى مَا : اس پر جو
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ : اور ہر ایک اُمت کے لیے
فَاِذَا جَآءَ : پس جب بھی آتا ہے
قُضِيَ : تو فیصلہ کر دیا جاتا ہے
بِالْقِسْطِ : انصاف سے
وَيَقُوْلُوْنَ : اور وہ کہتے ہیں
هٰذَا الْوَعْدُ : یہ وعدہ ہے
صٰدِقِيْنَ : سچ کہنے والے
لَآ اَمْلِكُ : مَیں اختیار نہیں رکھتا
ضَرًّا : کسی تکلیف کا
اِلَّا مَا : مگر وہ جو
لِكُلِّ اُمَّةٍ : ہر ایک اُمت کے لیے
اِذَا جَآءَ : جب بھی آئے گا
فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ : تو وہ لوگ نہ پیچھے ہوں گے
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ : اور نہ آگے ہوں گے

قُلْ: آپؐ کہیے

اِنْ اَتٰىكُمْ: (کہ) اگر آئے تمہارے پاس

بَيَاتًا: رات بسر کرتے ہوئے

مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ: وہ کیا چیز جلدی چاہتے ہیں

الْمُجْرِمُوْنَ: مجرم لوگ

اِذَا: جب

اٰمَنْتُمْ بِهٖ: تم ایمان لاؤ گے اس پر

وَقَدْ كُنْتُمْ: حالانکہ تم

ثُمَّ قِيْلَ: پھر کہا جائے گا

ظَلَمُوْا: ظلم کیا

عَذَابَ الْخُلْدِ: ہمیشگی کا عذاب

اِلَّا بِمَا: سوائے اس کے سبب سے جو

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ: اور وہ لوگ خبر مانگتے ہیں آپؐ سے (یعنی پوچھتے ہیں)

هُوَ: یہ (قرآن)

وَرَبِّيْٓ: میرے رب کی قسم ہے

وَمَآ اَنْتُمْ: اور تم لوگ نہیں ہو

وَلَوْ اَنَّ: اور اگر (ہوتا) کہ

ظَلَمَتْ: جس نے ظلم کیا

لَافْتَدَتْ بِهٖ: تو وہ ضرور خود کو چھڑاتی اسے دے کر

النَّدَامَةَ: ندامت کو

الْعَذَابَ: اس عذاب کو

بَيْنَهُمْ: ان کے مابین

وَهُمْ: اور ان پر

اَلَآ: سن لو

مَا فِي السَّمٰوٰتِ: وہ (سب کچھ) جو آسمانوں میں ہے

اَرَءَيْتُمْ: کیا تم نے غور کیا

عَذَابُهٗ: اُس کا عذاب

اَوْ نَهَارًا: یا دن کے وقت

مِنْهُ: اس (عذاب) میں

اَثُمَّ: کیا پھر

مَا وَقَعَ: وہ جو واقع ہوگا

اٰٰلْـٰٔنَ: کیا اب (مانتے ہو)؟

بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ: اس کی جلدی مچا چکے ہو

لِلَّذِيْنَ: ان سے جنہوں نے

ذُوْقُوْا: تم چکھو

هَلْ تُجْزَوْنَ: تمہیں کیا بدلہ دیا جائے گا

كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ: تم لوگ کماتے تھے

اَحَقٌّ: کیا حق ہے

قُلْ اِيْ: آپؐ کہیے ہاں

اِنَّهٗ لَحَقٌّ: بے شک یہ یقیناً حق ہے

بِمُعْجِزِيْنَ: عاجز کرنے والے (اس کو)

لِكُلِّ نَفْسٍ: ہر اُس جان کے لیے

مَا فِي الْاَرْضِ: وہ (سب کچھ) جو زمین میں ہے

وَاَسَرُّوا: اور وہ چھپائیں گے

لَمَّا رَاَوُا: جب وہ دیکھیں گے

وَقُضِيَ: اور فیصلہ کیا جائے گا

بِالْقِسْطِ: انصاف سے

لَا يُظْلَمُوْنَ: ظلم نہیں کیا جائے گا

اِنَّ لِلّٰهِ: یقیناً اللہ ہی کا ہے

وَالْاَرْضِ: اور زمین میں ہے

أَلَآ: خبردار رہو

حَقٌّ: حق ہے

أَكْثَرَهُمْ: ان کی اکثریت

هُوَ يُحْيِۦ: وہ زندگی دیتا ہے

وَإِلَيْهِ: اور اُسی کی طرف

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ: اے لوگو!

مَّوْعِظَةٌ: ایک نصیحت

وَشِفَآءٌ: اور ایک شفا

فِى ٱلصُّدُورِ: سینوں میں ہے

وَرَحْمَةٌ: اور رحمت

قُلْ: آپؐ کہیے

وَبِرَحْمَتِهِۦ: اور اُس کی رحمت سے (یہ آئی ہیں)

فَلْيَفْرَحُوا۟: پھر انہیں چاہیے کہ وہ خوش ہوں

مِّمَّا: اُس سے جو

قُلْ: آپؐ کہیے

مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ: اُس پر جو اتارا اللہ نے

مِّن رِّزْقٍ: کچھ رزق میں سے

مِّنْهُ: اس میں سے

وَحَلَٰلًا: اور کچھ کو حلال

ءَآذِنَ لَكُمْ: اجازت دی تم لوگوں کو

تَفْتَرُونَ: تم لوگ گھڑتے ہو (جھوٹ)

يَفْتَرُونَ: گھڑتے ہیں

ٱلْكَذِبَ: جھوٹ

إِنَّ ٱللَّهَ: بے شک اللہ

عَلَى ٱلنَّاسِ: لوگوں پر

أَكْثَرَهُمْ: ان کی اکثریت

إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ: یقیناً اللہ کا وعدہ

وَلَٰكِنَّ: اور لیکن

لَا يَعْلَمُونَ: جانتی نہیں ہے

وَيُمِيتُ: اور موت دیتا ہے

تُرْجَعُونَ: تم لوگ لوٹائے جاؤ گے

قَدْ جَآءَتْكُم: آ چکی ہے تمہارے پاس

مِّن رَّبِّكُمْ: تمہارے رب (کی طرف) سے

لِّمَا: اُس کے لیے جو

وَهُدًى: اور ہدایت

لِّلْمُؤْمِنِينَ: ایمان لانے والوں کے لیے

بِفَضْلِ ٱللَّهِ: اللہ کے فضل سے

فَبِذَٰلِكَ: پس اس سبب سے

هُوَ خَيْرٌ: یہ بہتر ہے

يَجْمَعُونَ: یہ لوگ جمع کرتے ہیں

أَرَءَيْتُم: کیا تم لوگوں نے غور کیا

لَكُم: تمہارے لیے

فَجَعَلْتُم: پھر تم لوگوں نے بنایا

حَرَامًا: کچھ کو حرام

قُلْ ءَآللَّهُ: آپؐ کہیے کیا اللہ نے

أَمْ عَلَى ٱللَّهِ: یا اللہ پر

وَمَا ظَنُّ ٱلَّذِينَ: اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا کا جو

عَلَى ٱللَّهِ: اللہ پر

يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ: قیامت کے دن کے بارے میں

لَذُو فَضْلٍ: یقیناً فضل والا ہے

وَلَٰكِنَّ: اور لیکن

لَا يَشْكُرُونَ: شکر نہیں کرتی

نوٹ ۱: زیر مطالعہ آیات ۴۲۔ ۴۳ کے مخاطبِ اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے توسط سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسلمان اس کے مخاطب ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ بہروں اور اندھوں کی رہنمائی نہیں کی جاسکتی۔ حالانکہ ایسے لوگوں کے نہ تو کان بہرے ہوتے ہیں اور نہ آنکھیں اندھی ہوتی ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے گزشتہ اسباق میں البقرۃ: ۷ کے نوٹ ۱۳ اور الاعراف: ۱۷۹ کے نوٹ ۲ کا دوبارہ مطالعہ کریں۔

آیات زیر مطالعہ کا منشا و مراد یہ یاد دلانا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام اپنے اپنے ظروف و احوال میں ہر شخص کا فرض ہے۔ اس جہاد کا نتیجہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے یہ اللہ کا کام ہے۔ اس لیے نتیجہ نہ نکلنے کی صورت میں دل برداشتہ نہ ہو اور اپنا فرض ادا کرتے رہو۔ البتہ ابتدائی کوشش کے بعد اگر واضح ہو جائے کہ کوئی شخص بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا تو اس سے خوبصورتی سے اعراض کر لو اور ایسے لوگوں کو تلاش کرو جن میں حقیقت کو سمجھنے کی طلب ہو کیونکہ پانی اُسے دیتے ہیں جسے پیاس ہو۔

نوٹ ۲: زیر مطالعہ آیت ۴۵ میں ہے کہ لوگ باہم ایک دوسرے کو پہچانیں گے یعنی جب قیامت میں مُردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ امام بغویؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ پہچان شروع میں ہوگی۔ بعد میں قیامت کے ہولناک واقعات سامنے آئیں گے تو یہ پہچان منقطع ہو جائے گی اور بعض روایات میں ہے کہ پہچان تو پھر بھی رہے گی مگر ہیبت کے مارے بات نہ کر سکیں گے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۳: زیر مطالعہ آیت ۵۹ میں رزق کا لفظ آیا ہے۔ اردو زبان میں رزق کا اطلاق کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دسترخوان کی چھوٹی سی دنیا میں مذہبی اوہام یا رسم و رواج کی بنا پر لوگوں نے کر ڈالی ہے۔ اس غلط فہمی میں عوام ہی نہیں علماء تک مبتلا ہیں۔ حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوراک کے معنی تک محدود نہیں بلکہ عطاء بخشش اور نصیب کے معنی میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی انسان کو دیا ہے وہ سب اُس کا رزق ہے حتیٰ کہ اولاد تک رزق ہے۔ مشہور دعا ہے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ یعنی اے اللہ! تُو ہمیں دکھا حق کو حق ہوتے ہوئے اور تُو ہمیں توفیق دے اس کی پیروی کرنے کی۔ یہاں رزق کا لفظ توفیق دینے کے معنی میں آیا ہے۔ پس رزق کو محض دسترخوان کی سرحدوں تک محدود سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان پابندیوں اور آزادیوں پر اعتراض ہے جو کھانے پینے کی چیزوں کے معاملہ میں لوگوں نے بطور خود اختیار کر لی ہیں سخت غلطی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ اس کی بدولت اللہ کے دین کی ایک بہت بڑی اصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ یہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت کا معاملہ تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے لیکن تمدن کے وسیع تر معاملات میں اگر یہ اصول طے کر لیا جائے کہ انسان خود اپنے لیے حدود مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے اور اسی بنا پر اللہ اور اُس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کی جانے لگے تو عامی تو درکنار علماءِ دین تک کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی دین سے اسی طرح ٹکراتی ہے جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں خود جائز و ناجائز کا فیصلہ کرنا۔ (تفہیم القرآن) ۞

مباحثِ عقیدہ

مؤمن محمود

راقم نے قرآن اکیڈمی کے فاضل استاذ عزیزم مؤمن محمود سلّمہٗ کا تعارف اور ان کی تدریسی و تحقیقی تگ و تاز کا ذکر حکمتِ قرآن کے گزشتہ شمارے میں کیا تھا۔ مَیں دلچسپی رکھنے والے قارئین سے ملتمس ہوں کہ اس شمارے کے صفحات ۱۱ اور ۱۲ پر دوبارہ نظر ڈال لیں تو مفید رہے گا۔ اسلام میں علم عقیدہ، علمِ کلام یا علم اصول الدین کا گہرا شعور ہی عصرِ حاضر کے تشکیکی اور الحادی فکر و تہذیب کا تدارک کر سکتا ہے۔ عقیدۂ توحید اور مسائل ذات و صفات، قدیم و حادث کا تعلق، اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت اور صفت علم اور عقیدے کے جملہ گوشوں (الٰہیات، نبوات، سمعیات وغیرہ) پر مؤمن محمود صاحب نے نہایت بصیرت افروز انداز میں کرونا لاک ڈاؤن کے دوران آن لائن لیکچرز کے سیریز میں گفتگو کی ہے۔ اگرچہ وہ ایک گھنٹہ دورانیہ کے ۳۷ لیکچرز دے چکے ہیں لیکن یہ موضوع ابھی مکمل نہیں ہوا۔ رجوع الی القرآن کورس کی تدریسی مصروفیات سے فرصت کے موقع پر وہ، ان شاء اللہ، اس کو مکمل کریں گے۔ فی الجملہ انہوں نے اپنے وسیع مطالعہ کی روشنی میں اشعری ماتریدی عقائد کی جدید پیرائے میں تشریح و توضیح کی ہے۔ میرا احساس ہے کہ اس علم میں تحقیق و تدقیق اور مطالعہ شاہد ہے کہ استاذ مؤمن محمود کا خود ان مباحث سے حضوری تعلق ہے، اور اپنے سامعین اور قارئین کے حوالے سے بھی انہیں حق تعالیٰ سے تعبدی تعلق میں گہرائی اور قلبی احوالِ حسنہ کی افزائش مطلوب ہے۔ قرآن اکیڈمی کے کارکنان نے پوری کوشش کی ہے کہ ان دروس کو افادۂ عام کے لیے ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ ممکن ہے کہ بعد ازاں مکمل ہونے پر اس کو علیحدہ کتابی شکل میں لاتے ہوئے نظرِ ثانی کر کے کچھ بہتری پیدا کر لی جائے۔ ابصار احمد

خطبہ مسنونہ کے بعد!

اللہ کے نام سے ہم درسِ عقیدہ کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ اس میں جو کتاب ہمارے پیشِ نظر رہے گی اس کا نام ہے: الاعتقاد والهداية الى سبيل الرشاد۔ یہ کتاب بہت بڑے محدث امام بیہقی رحمہ اللہ کی ہے، جو اگرچہ محدث کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں لیکن وہ متکلّم اور فقیہہ بھی تھے۔ یہ وہ فردِ وحید ہیں جن کے بارے میں امام غزالیؒ کے استاد امام الحرمین ابو المعالیؒ کی گواہی یہ ہے:

ما من شافعي الا والشافعي عليه منة الا البيهقي، فان له على الشافعي منة، لنصرة مذهبه

''کوئی شافعی نہیں ہے، یعنی شافعی فقہ سے تعلق رکھنے والا نہیں ہے مگر یہ کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کا اس پر

احسان ہے‘ سوائے امام بیہقی علیہ الرحمہ کے‘ ان کا امام شافعی علیہ الرحمہ پر احسان ہے‘ کیونکہ انہوں نے ان کے مذہب کی ترویج اور نصرت کی ہے۔‘‘

(بیہق‘ نیشاپور‘ ایران میں ایک بستی ہے‘ بلکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ بہت سی بستیاں ہیں جن کا ایک مشترکہ نام ہے: بیہق۔ تو جو بھی وہاں سے نسبت رکھتا ہے اس کو بیہقی کہتے ہیں۔ اس لیے صرف ان کے نام کے ساتھ ہی بیہقی نہیں بلکہ اور علماء کے ساتھ بھی بیہقی آجاتا ہے‘ لیکن سب سے مشہور یہی ہیں۔ ان کا پورا نام ہے: ابوبکر بن الحسین بن علی بن موسیٰ البیہقی علیہ الرحمہ۔ تو یہ ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہمارے بہت بڑے بڑے علماء جن کے ناموں کے آگے طوسی‘ اصفہانی‘ شیرازی‘ رازی لکھا ہوتا ہے یہ سب ایران سے ہیں۔ ایران کا ایک شہر ہے ’’رے‘‘ جو اس شہر سے نسبت رکھے گا وہ رازی کہلائے گا۔ ایک امام رازی تو بہت مشہور ہیں لیکن اس کے ساتھ درجنوں امام رازی ہیں۔ کوئی لغت کا امام ہے تو کوئی سائنس دان ہے‘ کوئی کیمیا کا ہے۔ ابوبکر الجصاص جو فقیہہ گزرے ہیں ان کے نام کے آخر میں بھی رازی آتا ہے۔ تو اصفہانی‘ شیرازی اور طوسی بھی بے تحاشا ہیں۔ اسی طرح بیہقی بھی متعدد ہیں۔)

امام بیہقی علیہ الرحمہ مجتہد مطلق تھے‘ لہٰذا بعض علماء نے فرمایا کہ اگر وہ چاہتے تو اپنا ایک مذہب فقہی بھی بنا سکتے تھے‘ لیکن بہرحال وہ امام شافعی علیہ الرحمہ کے مقلد ہیں۔ ان کی جتنی بھی کتابیں ہیں ان میں محدثانہ شان ہے۔ محدثانہ شان سے مراد یہ ہے کہ کتابوں کی بنیاد روایات پر ہوتی ہے اور اپنا کلام کم ہوتا ہے۔ آپ اس کتاب میں بھی دیکھیں گے جو بنیادی طور پر حدیث کی ایک کتاب کہلانے کے لائق ہے کہ احادیث نقل کرنے کے بعد کچھ اپنی گزارشات بھی بیان فرماتے ہیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب ’’شعب الایمان‘‘ ہے۔ ایک نو جلدوں پر مشتمل ان کی حدیث کی کتاب ہے: ’’السنن الکبیر‘‘۔ اسی طرح ایک ’’السنن الصغیر‘‘ بھی انہوں نے لکھی ہے۔ پھر عقیدے میں ان کی دو مشہور کتابیں ہیں‘ ان میں سے ایک کتاب کے مضامین کی ترتیب کی ہم پیروی کریں گے یعنی الاعتقاد والھدایۃ الی سبیل الرشاد۔ دوسری کتاب بھی بہت عمدہ ہے: الاسماء والصفات‘ جو دو جلدوں میں ہے۔ آپ نوٹ کریں گے کہ الاعتقاد والی کتاب میں بھی وہ الاسماء والصفات کتاب کا حوالہ دیتے ہیں‘ جس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب اس سے ماقبل ہے۔

جیسا کہ تمام اہلِ علم جانتے ہیں لفظ ’’عقیدہ‘‘ بعد میں آیا ہے۔ یعنی لفظ عقیدہ اس معنی میں یعنی ایمانیات‘ آرٹیکلز آف فیتھ اور جن جن چیزوں کو ماننا ضروری ہے‘ اس حوالے سے مستعمل بعد میں ہوا ہے۔ ابتدائی صدیوں میں اس طریقے پر عقیدے کا لفظ نہیں تھا‘ لیکن کچھ ایسے مشتقات تھے یا کچھ ایسے افعال تھے جو استعمال ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ تو کہا جاتا تھا کہ اَعْتَقِدُ مَیں اعتقاد رکھتا ہوں‘ لیکن لفظ عقیدہ اس علم پر اسم عَلَم کے طور پر بعد میں آیا۔ تو لفظ عقیدہ کا معنیٰ کیا ہے؟ علماء نے کہا کہ عقیدہ اصلاً گرہ کو کہتے ہیں۔ جیسے عقدہ ہے‘ اسی طرح عقیدہ بھی ہے۔ عَقَدَ یَعْقِدُ کہتے ہیں گرہ لگانا۔ گویا کسی بات پر دل جم جائے‘ دل کی گرہ لگ جائے اور ایسا یقین اور اطمینان پیدا ہو جائے کہ غیر کا احتمال نہ رہے۔ چنانچہ عقیدہ کی تعریف علماء کلام اور علماء اصولِ دین نے یوں کی ہے

کہ کسی بات پر ایسا اطمینان اور جزم حاصل ہوجانا کہ غیر کا احتمال نہ رہے۔ یہ اعتقاد ہے' چاہے یہ یقین اور اعتقاد بر بنائے دلیل ہو یا نہ ہو' یعنی اعتقاد کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ آپ کا وہ اعتقاد کسی دلیل کے تابع ہو۔ بہرحال یہ مسئلہ ابھی ہم تھوڑی دیر بعد دیکھیں گے کہ کیا عقیدے میں تقلید جائز ہے اور کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ مَیں مسلمان صرف اس لیے ہوں کہ میرے ماں باپ مسلمان ہیں۔ میرے پاس مسلمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ میرے والدین مسلمان ہیں۔ اس کو ہم کہتے ہیں: عقیدے میں تقلید۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ عقیدے میں تقلید جائز ہے یا نہیں' عقیدہ کسی بھی شے پر جزم اور یقین کے حاصل ہوجانے کو کہتے ہیں۔ ایسا یقین کہ جس میں احتمال غیر معدوم ہو۔ بہرحال یہ عقیدہ دین میں مطلوب ہے۔ یعنی ہر وہ بات جس کو ماننے کا حکم دیا گیا ہے' اس میں غیر کا احتمال نہیں ہوسکتا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں دل میں یہ خیال آجائے کہ ہوسکتا ہے توحید برحق نہ ہو' تو یہ عقیدہ اور ایمان نہیں ہوگا۔ یہ ظن ہے' ظن غالب بھی ہوسکتا ہے اور مرجوح بھی ہوسکتا ہے' شک بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی رسالت کے بارے میں اگر دل میں یہ گمان پیدا ہوجائے یا یہ احتمال پیدا ہوجائے کہ پچانوے فیصد تو احتمال ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں لیکن پانچ فیصد احتمال یہ بھی ہے کہ شاید آپ ﷺ اللہ کے رسول نہ ہوں' تو اسے بھی عقیدہ اور ایمان نہیں کہیں گے۔ بلکہ قرآنِ مجید میں مشرکینِ مکّہ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ ان سے جب کہا جاتا کہ قیامت برحق ہے تو ان کا یہ جواب ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝﴾ (الجاثیۃ)

''اور جب کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور قیامت آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے' ہاں ہمیں ایک گمان سا تو ہوتا ہے اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔''

بہرحال عقیدہ کیا ہے؟ عقیدہ کچھ بڑے بڑے حقائق نفس الامر کو مان لینے کا نام ہے جن کی بنا پر انسان اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ یعنی ہر وہ شے جو شرطِ دخولِ اسلام ہے' جس کے بغیر اسلام متصور نہیں ہوسکتا' وہ عقیدے میں شامل ہے۔ اور ہر وہ شے جس کو ماننے یا نہ ماننے پر اسلام کا دارومدار نہیں ہے' وہ شے عقیدے میں داخل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وجود' اللہ کی وحدانیت اور اللہ کی صفت کلام' کیونکہ صفت کلام پر رسولوں کا دارومدار ہے۔ اسی طرح ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت ہے۔ تو یہ وہ تین حقائق ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو منہا کردیں تو اسلام باقی نہیں رہے گا۔ لیکن اس کے سوا بھی ہمارے کچھ عقائد ہیں' جن کو ہم عقائد کہتے ہیں لیکن وہ عقائد کا یہ درجہ نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزولِ ثانی پر ایمان لانا۔ تو یقیناً ایمان لانا ہے' کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ سے تواتر کے ساتھ آپؑ کا نزولِ ثانی ثابت ہے' لیکن کیا یہ وہ شے ہے جس کو اسلام اور کفر کی بنیاد بنایا جائے گا؟ (بنایا جاسکتا ہے شرائط کے ساتھ!) مثال کے طور پر ایک شخص مسلمان ہوا اور اس نے

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزولِ ثانی کے بارے میں کبھی سنا ہی نہیں تو کیا وہ شخص مسلمان شمار ہوگا؟ یقیناً شمار ہوگا! البتہ ایک شخص مسلمان ہوتا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں یا نہیں' تو ایسا شخص مسلمان متصور نہیں ہوسکتا۔ یا قیامت نے آنا ہے یا نہیں آنا؟ یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں اسے شک ہو جائے۔ تو عقیدے میں ہم عموماً ان اشیاء کو پڑھتے ہیں کہ جن پر اسلام کا دارومدار ہے۔

اس کتاب میں امام بیہقی علیہ الرحمہ نے سب سے پہلا عنوان یہ قائم کیا ہے کہ انسان پر سب سے پہلا واجب کون سا ہے؟ یعنی جب ایک شخص مکلّف ہوتا ہے۔ بچہ ہے تو ابھی مکلّف نہیں ہوا۔ جیسے ہی اس نے بلوغ میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اللہ کا اس سے مطالبہ کیا ہے؟ جیسے ہی وہ بالغ ہوا ہے اللہ کا مطالبہ اس سے یہ ہے کہ نماز پڑھو' یا یہ ہے کہ ایمان لاؤ' یا یہ ہے کہ غور وفکر کرو' یا یہ ہے کہ زبان سے شہادتین کا اقرار کرو: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ! بہرحال امام بیہقی علیہ الرحمہ یہ عنوان قائم کرتے ہیں کہ انسان پر سب سے پہلا واجب کون سا ہے؟ اب یہاں ہمارے اکثر علماء کہتے ہیں کہ سب سے پہلا واجب ہے اللہ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرنا۔ یہ عموماً محدثین کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلا واجب ہے کہ جیسے ہی آپ بالغ ہوں تو آپ کہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب لوگ مسلمان ہونے کے لیے آتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ نہیں کہتے تھے کہ پہلے غور وفکر کرو' پہلے ایمان لانے پر دلیل حاصل کرو' بلکہ کہتے تھے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دو اور اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ تو بہت سے علماء نے کہا کہ پہلا واجب تو بس یہی ہے کہ اقرارِ شہادتین ہو۔ تو جو ہمارے علماءِ کلام یا علماءِ عقیدہ ہیں ان کے ہاں کچھ اور اقوال بھی ملتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلا واجب یہ ہے کہ انسان غور وفکر کرے' نظر دوڑائے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٥﴾﴾ (الاعراف)

''اور کیا ان لوگوں نے غور وفکر نہیں کیا آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں اور اللہ نے جو چیزیں بنائی ہیں (ان میں) اور یہ (نہیں سوچا) کہ ہوسکتا ہے ان کا مقررہ وقت قریب پہنچ گیا ہو! اور اب اس کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟''

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ ......﴾ (الغاشیۃ)

''تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کو کہ انہیں کیسے بنایا گیا ہے!......'' (وغیرہ وغیرہ)

تو وہ کہتے ہیں کہ پہلا واجب تو یہ ہے کہ آپ غور وفکر کریں۔

امام ابوالحسن اشعری علیہ الرحمہ نے کہا کہ پہلا واجب المعرفة ہے: معرفة باللّٰه وصفاته' اللہ سبحانہ

وتعالیٰ کی معرفت اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کی معرفت۔ یہ انسان پر سب سے پہلا واجب ہے۔ بعض نے کہا کہ انسان پر سب سے پہلا واجب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ہے‘ اور جیسے ہی آپ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائیں گے تو یقیناً آپ اللہ پر بھی ایمان لے آئے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت پر بھی ایمان لائے۔ اور ایک قول وہ ہے جس کو ہمارے اہلِ سُنّت نے نہیں مانا۔ وہ ابو ہاشم الجبائی (جو معتزلہ کے ایک بڑے امام تھے) کا قول تھا کہ سب سے پہلا واجب ہے: شک۔ یعنی سب سے پہلے انسان شک کرے اور شک کے نتیجے میں انسان یقین کی طرف سفر طے کرے۔ تو ہمارے علماء اہلِ سُنّت نے کہا کہ شک کو پہلا واجب قرار دے دینا بہت خطرناک ہے‘ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بالغ ہونے کے بعد اگر آپ نے بچپن سے ایمان اور اعتقاد حاصل کر لیا تھا تو بالغ ہونے کے بعد ضروری ہے کہ پہلے اس ایمان اور اعتقاد کے بارے میں شک پیدا کر دیا جائے اور شک کے بعد یقین کی طرف سفر طے کیا جائے۔ البتہ اہل سُنّت نے کہا کہ ہاں اگر شک پیدا ہو گیا تو اب لازم ہے کہ یقین کی طرف سفر طے کیا جائے‘ لیکن شک کا پیدا کرنا لازم نہیں ہے‘ بلکہ ناجائز ہے۔

تو یہ مختلف اقوال ہیں‘ ان میں ہمارے علماء نے کیا تطبیق کی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو اصل مقصود تو اللہ اور اس کے رسول کی معرفت ہے۔ یعنی جس نے کہا کہ شہادتین اصل میں پہلا واجب ہے تو اُس نے بھی ٹھیک کہا۔ اس لیے کہ شہادتین تک پہنچنا مقصود ہے۔ یعنی اصل مقصود یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے‘ اُس کی صفات کے ساتھ اور ایسی معرفت کہ جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ پر بھی انسان ایمان لے آئے‘ اور پھر ایمان لانے کے بعد اللہ کی معرفت میں مزید بڑھتا چلا جائے۔ اور جن لوگوں نے کہا کہ سب سے پہلا واجب غور وفکر ہے تو ان کی مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کو ابھی اعتقادِ جازم حاصل نہیں ہوا۔ یعنی جو بلوغت تک پہنچتا ہے اور اُسے اعتقادِ جازم ابھی حاصل نہیں ہوا تو اُس پر واجب ہے کہ وہ غور وفکر کرے۔ یعنی اگر انسان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت یقینی اور قطعی طور پر حاصل نہیں ہوئی تو اُس پر غور وفکر لازم ہے۔ اور پھر ایک بات کا اضافہ ہمارے علماء نے یہ کیا کہ اگر آپ کو اعتقادِ جازم حاصل ہو گیا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر اور اللہ کے رسول پر‘ لیکن یہ اعتقادِ جازم بغیر دلیل کے ہے تو پھر بھی آپ پر واجب ہے کہ غور وفکر کریں۔

یہ ایک اہم نکتہ ہے جس سے ہماری اگلی بحث شروع ہو گی۔ وہ بحث ہے کہ علماء اہل سُنّت کے نزدیک ایمان اور اعتقاد میں تقلید ہو سکتی ہے یا نہیں؟ یعنی بالغ ہوتے وقت آپ کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر کامل یقین حاصل ہے تو تب بھی کیا آپ کے لیے ضروری ہے کہ غور وفکر کریں اور دلیل حاصل کریں‘ یا بس آپ اپنے اس اعتقاد پر اکتفا کر کے بیٹھ جائیں؟ تو ہمارے علماء اہلِ سُنّت (علماء کلام) نے کہا کہ تب بھی واجب ہے۔ یعنی اگر بغیر دلیل کے اعتقاد حاصل ہو گیا تو اب دلیل حاصل کرنا اور اپنے ایمان کو علیٰ وجہ البصیرہ بنانا لازم ہے۔ کیوں لازم ہے؟ کیا دلیل ہے کہ اعتقاد میں دلیل حاصل کرنا ضروری ہے؟ انہوں نے کہا دیکھو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا اپنے آباء واَجداد کی تقلید کی مذمت کی ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ

كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (البقرۃ)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس کی جو اللہ نے نازل کیا ہے وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو پیروی کریں گے اُس طریقے کی جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے آباء واَجداد نہ کسی بات کو سمجھ پائے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوئے ہوں (پھر بھی وہ اپنے آباء واَجداد ہی کی پیروی کرتے رہیں گے؟)''

تو اگر اعتقادِ جازم ہو اور بغیر دلیل کے ہو تو یہ حُجّت تو مشرکینِ مکّہ کے لیے بھی ہو جائے گی۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم تو اپنے آباء واَجداد کے دین پر راضی ہیں اور ہمیں دلیل کے ذریعے اس دین کو ثابت کرنے کی حاجت نہیں ہے اور اے رسول (ﷺ) جو دعوت تم دے رہے ہو اُس کو بھی دلیل کے ذریعے سے پرکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو مکتفی ہیں، ہمیں تو اکتفا حاصل ہے اپنے پرانے دین پر۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جابجا اصولِ دین میں تقلید کو مذموم قرار دیا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ تقلید کو مذموم قرار دیا گیا ہے اصولِ دین میں، فروعِ دین میں نہیں۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ کچھ لوگ اُن آیات کو کہ جن میں اصولِ دین میں تقلید کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ مذموم قرار دے رہے ہیں، ان سے استدلال کر کے فروعِ دین میں بھی تقلید کو حرام قرار دیتے ہیں، حالانکہ فروعِ دین میں تقلید ضروری ہے۔ فروعِ دین کیا ہیں؟ وہ معاملات جو اصولِ دین یا اعتقاد سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ عملی مسائل ہیں، اجتہادی مسائل ہیں، فروعی مسائل ہیں، جن میں ائمہ نے اجتہاد کیا ہے۔ تو ایسے مسائل میں تقلید ایک عام آدمی کے لیے ضروری ہے، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکم بھی دیا ہے:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷﴾﴾ (الانبیاء)

''اگر تمہیں نہیں معلوم تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو!''

لیکن کیا اعتقاد میں بھی تقلید جائز ہے؟ سوال کیا جاتا ہے کہ اعتقاد میں تقلید ہوتی کیا ہے؟ اعتقاد میں تقلید یہ ہے کہ اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ تم اللہ کو کیوں مانتے ہو؟ تو میرے پاس سوائے اس جواب کے اور کوئی جواب نہ ہو کہ مَیں اللہ کو صرف اس لیے مانتا ہوں کیونکہ میرے والدین مانتے ہیں، اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی وجہ نہیں ہے خدا کو ماننے کی۔ پوچھا جائے کہ تم رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر کیوں ایمان رکھتے ہو؟ تو جواب یہ ہو کہ بس میرے گھر والے ایمان رکھتے ہیں تو مَیں بھی ایمان رکھتا ہوں۔ میرے پاس رسول اللہ ﷺ کو ماننے کی کوئی دلیل نہیں ہے سوائے اس کے کہ میرے والدین مانتے ہیں۔ اگر ایسی تقلید دین میں جائز قرار دے دی جائے تو پھر تمام باطل ادیان بھی justified ہو جاتے ہیں۔ یعنی سب لوگ یہی کرتے ہیں۔ کوئی عیسائی ہے، وہ عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا، اس نے کہا کہ میرے والدین عیسائی ہیں تو میں بھی عیسائی ہو جاتا ہوں، مجھے دلیل وغیرہ کی حاجت نہیں ہے۔ مَیں مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تو مَیں نے کہا کہ والدین مسلمان ہیں تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اسی طرح بدھ مت والے بھی ہیں، اور ادیان بھی ہیں۔ تو اگر ہم یہی دلیل اختیار کر لیں تو ہم تو کسی کو دعوت بھی نہیں دے سکتے۔

ہم دعوت کس بنیاد پر دیں گے؟ ہم یہی کہیں گے نا کہ تمہارا دین باطل ہے‘ اور ہم نے خود اپنے دین میں یہ قول اختیار کیا ہوا ہے کہ بغیر دلیل کے بھی مان لینا درست ہے‘ تو وہ بھی بغیر دلیل کے مان رہے ہیں تو ان کو بھی ماننے دو۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اصولِ دین میں تقلید جائز نہیں ہے۔ یہ ہمارے علماء کلام‘ علماء عقیدہ کا قول ہے کہ اصولِ دین میں تقلید جائز نہیں ہوتی‘ البتہ فروعِ دین میں واجب ہے‘ یعنی فروعِ دین میں تقلید ضروری ہے۔ ہم مقلد ہوں گے امام شافعیؒ کے یا امام ابوحنیفہؒ کے‘ لیکن اصولِ دین میں آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں اپنے باپ دادا کا مقلد ہوں۔

اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اصولِ دین میں تقلید جائز نہیں ہے تو جو عقیدے میں مقلد ہیں وہ مسلمان ہیں بھی یا نہیں؟ اور یہ زیادہ اہم سوال ہے۔ کیونکہ کچھ حضرات نے علماء عقیدہ کے اس قول پر کہ اصول دین میں تقلید جائز نہیں ہے‘ یہ کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ تمام لوگوں کی تکفیر کر رہے ہیں۔ یعنی اکثر لوگ تو مسلمان تقلیداً ہی ہوتے ہیں‘ علیٰ وجہ البصیرۃ تو نہیں ہوتے۔ تو ان کے اس قول کا لازمہ یہ نکلے گا کہ اکثر لوگ مسلمان نہیں ہیں‘ بلکہ کافر ہیں‘ چاہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں کافر ہوں‘ اگرچہ دُنیا میں ہم انہیں ایک حد تک مسلمان سمجھیں! تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اب یہ اہم بات ہے اس کو بھی سمجھ لیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم تقلید کو واجب کہہ رہے ہیں اصولِ دین میں‘ لیکن تقلید کرنے والا عاصی ہے‘ گنہگار ہے‘ کافر نہیں ہے‘ اگر اسے اعتقادِ جازم حاصل ہو۔ یعنی اگر وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر یقین رکھتا ہے‘ اگرچہ یہ یقین پیدا ہوا ہے تقلید سے‘ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں‘ تو ایسا شخص گنہگار شمار ہوگا‘ کافر شمار نہیں ہوگا۔ تو کیا اس قول کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان گنہگار ہیں؟ اور یہ بھی جان لیں کہ یہ گناہ ان کے ہاں معصیت کبیرہ ہے۔ تو اکثر مسلمان تو دلیل پر نہیں ہیں تو کیا وہ کبیرہ گناہ کے مرتکب ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ کیوں نہیں ہے؟ ابھی تو آپ نے کہا کہ اصولِ دین میں تقلید مجرد حرام ہے اور جو لوگ تقلید کر رہے ہیں وہ گنہگار ہیں۔ اب اکثر مسلمان تو تقلید کر رہے ہیں لہٰذا وہ گنہگار ٹھہرے؟ انہوں نے کہا نہیں! آپ کا خیال غلط ہے‘ اکثر مسلمان تقلید نہیں کر رہے۔ وہ کیسے؟ انہوں نے کہا کہ آپ اگر کسی سے پوچھیں کہ تم مسلمان کیوں ہو؟ تو وہ یہ جواب نہیں دے گا کہ میرے والدین مسلمان تھے اس لیے میں مسلمان ہوں۔ وہ کوئی نہ کوئی دلیل ضرور دے گا۔

ابھی ہم دلیل میں فرق کریں گے۔ یعنی میں آپ سے پوچھوں یا ریڑھی پر ایک آم بیچنے والے سے جا کے پوچھوں کہ تم خدا کو کیوں مانتے ہو؟ تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ میں اس لیے مانتا ہوں کہ میرے والدین مانتے تھے‘ بلکہ وہ کہے گا کہ دیکھو یہ اللہ کی قدرتیں ہیں‘ نشانیاں ہیں‘ یہ کائنات ہے‘ یہ سب اللہ نے بنائی ہے۔ وہ دلیل دے گا۔ اس سے پوچھیں گے کہ تم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو کیوں مانتے ہو؟ تو وہ آگے سے یہ نہیں کہے گا کہ ابا جان مانتے ہیں۔ وہ کہے گا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے بڑھ کر کوئی شخصیت کیا ہوگی؟ آپ ان کے اخلاق دیکھو‘ ان کے معجزات دیکھو‘ آپ ﷺ کے کارنامے دیکھو‘ آپ ﷺ کی صفات دیکھو تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ گویا ہر مسلمان کو دلیل اجمالی حاصل ہے۔ دلیل اجمالی ایسے شخص کو جو عامی ہو‘ تقلید سے

نکال دیتی ہے۔یعنی فروعات میں تو آپ کو ایسے لوگ مل جائیں گے جن سے پوچھا جائے کہ تم رفع الیدین کیوں نہیں کرتے؟ وہ آپ سے کہیں گے کہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں' مجھے زیادہ نہیں پتا' میں اس لیے رفع الیدین نہیں کرتا۔لیکن آپ کو ایسا شخص واقعی نہیں ملے گا' یا بہت ہی شاذ و نادر ہوگا جس سے آپ پوچھیں کہ تم خدا کی توحید کو کیوں مانتے ہو؟ تو وہ کہے کہ فلاں مانتا ہے اس لیے مانتا ہوں۔ایسے بہت کم لوگ ہوں گے۔بلکہ وہ کوئی نہ کوئی دلیل پیش کرے گا۔وہ دلیل اجمالی ہوگی۔تو دلیل اجمالی اور دلیل تفصیلی میں یہ فرق ہوا کہ دلیل اجمالی وہ دلیل ہے کہ آپ دلیل تو دے دیں لیکن اگر کوئی شخص اس پر شبہ وارد کر دے تو آپ شبہات کے جواب دینے پر اپنے آپ کو قادر نہ پائیں۔اور اگر آپ ان شبہات کو دلیل کے ساتھ رد کر سکیں تو اب آپ دلیل تفصیلی پر کھڑے ہوں گے۔

یہ دلیل تفصیلی فرض کفایہ ہے' یعنی ہر جگہ اور ہر مقام پر کچھ ایسے علماء' کچھ ایسے اصحاب علم موجود ہونے چاہئیں کہ جو عقیدے پر وارد ہونے والے شبہات کا دلیل کے ساتھ' تفصیل کے ساتھ جواب دے سکیں۔ان کو ہم علماء عقیدہ' علماء اصولِ دین اور علماء کلام کہتے ہیں۔باقی میرے اور آپ جیسے جو عامی ہیں ان کے لیے واجب ہے کہ ہمارے پاس کم از کم دلیل اجمالی تو ہو۔کوئی پوچھے کہ تم خدا کو کیوں مانتے ہو؟ اگر آپ آگے سے یہ بھی کہہ دیں کہ مَیں نے قرآن پڑھا ہے اور جو قرآن پڑھے گا اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اللہ ہی کا کلام ہے تو بس یہ کافی دلیل ہے۔یہ دلیل اجمالی ہے' اس کے نتیجے میں آپ بلائنڈ فیتھ سے نکل چکے ہیں۔اب آپ' اِن شاء اللہ' علیٰ وجہ البصیرہ ہیں' لیکن علیٰ وجہ البصیرہ کے نچلے درجہ پر ہیں۔دلیل اجمالی یا دلیل تفصیلی' یہ ساری علماء کلام کی اصطلاحات ہیں۔بہرحال یہ اصطلاحات بھی ہمارے سامنے آجائیں تو زیادہ بہتر ہے۔یعنی کئی دفعہ ہم یوں بھی کہتے ہیں کہ ایمان علیٰ وجہ البصیرہ حاصل کرنا ضروری ہے اور جو اکثر مسلمان بلائنڈ فیتھ پر کھڑے ہوئے ہیں اور صرف اس لیے مسلمان ہیں کہ ان کے والدین مسلمان تھے تو یہ بات اپنے عموم میں اتنی درست نہیں ہے' کیونکہ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی درجے میں دلیل اجمالی حاصل ہے۔بلکہ اگر آپ غور کریں گے تو جیسے آم بیچنے والے کی مثال دی گئی تو اس کو جو دلیل اجمالی حاصل ہے وہ بہت سے لوگوں کی دلیل تفصیلی سے قوی ہوتی ہے۔یعنی اس کو اس دلیل اجمالی کی بنیاد پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر گہرا یقین اور ایمان حاصل ہے۔ہمارے گھر میں جو دودھ والا آتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ پر جتنا ایمان و یقین ہے موجودہ کرونا کی وبا کے حالات میں' وہ یقین ہمیں تو بالکل حاصل نہیں' ہم تو بالکل ڈرے ہوئے ہیں۔لیکن وہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ موت کا تو ایک وقت معیّن ہے' وہ وقت آگے پیچھے نہیں ہو سکتا اور ہمارے نبی ﷺ نے کہا ہے کہ مسلمان کا جھوٹا (چھوڑا ہوا پانی یا کھانا) بھی شفا دینے والا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ کسی کے قریب نہیں جانا.....وغیرہ۔اگرچہ اس کو نہیں معلوم ہوگا لیکن وہ ایک یقین اور ایمان کی سطح پر کھڑا ہوا ہے۔اسے دلیل اجمالی حاصل ہے اور وہ علیٰ وجہ البصیرہ ہے۔تو علیٰ وجہ البصیرہ کے درجات بہت سے ہیں اور ایک ادنیٰ درجہ اس کا جو ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے وجود پر' اللہ کی وحدانیت پر' رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر اور آخرت کے وقوع پر پوری دلیل اجمالی رکھتا ہے۔اب اگر پوچھا جائے کہ آخرت ہونی چاہیے؟ تو میں کہوں گا

ہونی چاہیے۔ کیوں ہونی چاہیے؟ اس لیے کہ جو لوگ گنہگار ہیں ان کو ان کے گناہوں کی سزا ملے‘ جو نیکو کار ہیں ان کو ان کی نیکی کی جزا ملے۔ بالکل کافی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی دی ہے کہ

﴿اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ (القلم)

’’کیا ہم اپنے فرماں برداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے‘ تم کیسے حکم لگاتے ہو؟‘‘

اس ساری گفتگو کے نتیجے میں یہ بات معلوم ہوئی کہ اصولِ دین یعنی اعتقادات میں تقلید مجرد جائز نہیں ہے‘ مذموم ہے۔ پھر جائز نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو تقلید کر رہا ہے وہ گنہگار ہے۔ استقلید سے نکلنے کے لیے دلیل اجمالی کافی ہے۔ جو شخص بھی دلیل اجمالی رکھتا ہے اللہ کے فضل سے وہ تقلید نہیں کر رہا۔ اور دلیل اجمالی کی ہم نے تعریف کی تھی کہ ہر وہ دلیل جو اجمال رکھتی ہو اور اپنے اوپر وارد ہونے والے شبہات کا جواب نہ دے سکتی ہو۔ دلیل اجمالی والے کی ذمہ داری کیا ہے؟ اگر اس پر شبہ وارد ہوتا ہے تو دلیل تفصیلی والے کے پاس جائے یعنی عالم کے پاس جائے‘ اُس سے جا کر پوچھے کہ یہ شبہ وارد ہو گیا ہے تو اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تفصیل میں نے اس لیے بیان کی کہ اب ہمارے ہاں چونکہ سطحیت بہت پیدا ہو چکی ہے تو آپ کو بہت سی کتابوں میں ایسا نظر آئے گا کہ وہ علماءِ کلام پر اس طرح کی تنقید کر رہے ہوتے ہیں کہ انہوں نے تو مسلمانوں کو کافر کہہ دیا۔ انہوں کہہ دیا کہ اصولِ دین میں تقلید حرام ہے‘ تو جو شخص تقلید کر رہا ہے تو وہ کافر ہو گیا! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عامۃ المسلمین کُفّار ہیں ..... وغیرہ وغیرہ۔ تو ہمارے علماءِ کلام نے تفصیل سے ان تمام لوازم کا جواب دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کے سامنے اختصار کے ساتھ یہ بات واضح کی ہے کہ اس سے نہ مسلمانوں کی تکفیر لازم آتی ہے اور نہ تفسیق یعنی نہ انہیں فاسق قرار دینا لازم آتا ہے‘ بلکہ دلیل اجمالی وہ ہے جو ہر مسلمان پر واجب ہوتی ہے۔

تو سب سے پہلا باب ہے: اول مایجب علی العبد معرفۃ والاقرار بہ —— پہلی شے جو بندے پر واجب ہوتی ہے کہ اس کا اقرار کرے اور اس کی معرفت حاصل کرے‘ وہ کیا ہے؟ اس میں انہوں نے قرآن مجید کی ایک آیت (سورۃ محمدؐ آیت ۱۹) سے استدلال کیا: ﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ﴾ استدلال یہ ہے کہ ’’اعلم‘‘ فعل امر ہے اور الامر للوجوب الا للقرینۃ الصارفۃ۔ یعنی فعل امر ہوتا ہے وجوب کے لیے الا یہ کہ کوئی دلیل آ کر اسے استحباب کے لیے پھیر دے۔ تو کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت یعنی توحید کی معرفت استحبابی ہے؟ استحبابی تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا بلکہ اس کا وجوب ثابت ہے۔ تو ’’فَاعۡلَمۡ‘‘ میں فعل امر وجوب کے لیے ہوا۔ اور ’’اَنَّہٗ‘‘ سے اس میں مزید شکوہ پیدا کیا۔ فَاعۡلَمۡ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بھی ہو سکتا تھا: جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لیکن فرمایا: ﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ﴾۔ یہ سب سے بڑی معرفت ہے‘ جان لو کہ شان یہ ہے‘ قصہ یہ ہے‘ حقیقت یہ ہے‘ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہو رہی! تو یہ بات جان لینے کی ہے۔ ’’فَاعۡلَمۡ‘‘ سے متکلمین نے یہ دلیل نکالی کہ یہاں صرف یہ بات نہیں ہو رہی: اعتقد انہ لاالہ الا اللہ‘ بلکہ اِعۡلَمۡ کہا اور علم اور اعتقاد میں یہ فرق ہے کہ اعتقاد تو بغیر دلیل کے بھی ہو سکتا ہے اور علم میں کم از کم دلیل اجمالی تو

ہوتی ہے۔ چنانچہ ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ میں اعْلَم کے اندر دلیل حاصل کرنے کا بھی حکم دیا کہ گویا کہا جارہا ہے: فَاعْلَمْ ''پس جان لو دلیل کے ساتھ۔''

ایک بات ہمیں واضح ہونی چاہیے کہ ایک سوال سب کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ اگر آپ متکلمین یا علمائے اصول الدین کے اس منہج پر کھڑے نہیں ہوتے تو آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ تم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے اور مسلمان ہو اور وہ عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا اور عیسائی ہے کیا فرق ہے؟ یعنی تم بھی تقلید کر رہے ہو وہ بھی تقلید کر رہا ہے۔ اس کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آتا۔ کس بنیاد پر انہیں دعوت دیتے ہو؟ بس ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اصولِ دین میں اللہ نے کہا ہے تقلید نہیں کرنی' کافروں کو بھی یہی حکم ہے اور آپ کو بھی یہی حکم ہے کہ اصولِ دین میں صرف اس بنیاد پر ایمان نہیں رکھنا کہ میرے آباء واجداد ایمان رکھتے ہیں۔ تو اگر آپ یہ طریقہ اختیار کریں گے تو' اِن شاء اللہ' کچھ نہ کچھ جواب دیا جاسکتا ہے' اگرچہ حتمی جواب نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل میں یہ اللہ کا فضل ہے' یہ اللہ کی وہبی نعمت ہے جو اللہ نے دی ہے کہ آپ کو مسلمان گھرانے میں پیدا کیا اور کسی کو نہیں کیا۔ تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس کا جواب اصلاً یہی ہے کہ ﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ اختصاص فرماتے ہیں جس کا چاہتے ہیں۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔ ہمیں اس کا احساس نہیں ہے' لیکن احساس کرنا چاہیے کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوجانا اور اللہ پر کامل یقین اور اس کے رسول ﷺ کی رسالت پر کامل اعتقاد حاصل ہوجانا یہ ایسی نعمت ہے جس کے مثل اس دنیا میں کوئی نعمت نہیں' یعنی نعمت ہدایت ہمیں حاصل ہوگئی ہے اور اللہ کے فضل سے حاصل ہوگئی ہے۔ تو یہ دلیل اختیار کی متکلمین نے۔

﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ تو یہ توحید کی دلیل ہوگئی۔ اب رسالت کی دلیل کیا ہے؟ اگلی آیت لاتے ہیں:

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (ھود: ۱۴) ''پس جان لو کہ جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا ہے وہ اللہ کے علم کے ساتھ نازل ہوا ہے''۔ ''بِعِلْمِ اللّٰهِ'' کے دو ترجمے ہوسکتے ہیں' اللہ کے علم کے ساتھ یا اللہ کا علم لے کر نازل ہوا ہے۔ یعنی اس قرآن مجید کے اندر اللہ کا علم موجود ہے۔ تو یہ بات بھی جان لینے کی ہے: فاعلموا۔ تو یہاں بھی الامر للوجوب ہے۔ تو گویا قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کی معرفت حاصل کرنا بھی ہر مسلمان پر واجب ہوگیا۔ اور پھر دیکھیں آخرت کے اعتبار سے..... اگرچہ آخرت (کے لیے دلیل) کی ضرورت نہیں رہی' کیونکہ آخرت کا تعلق سمعیات سے ہے' یعنی رسول اللہ ﷺ کے کہنے سے پتا چلتا ہے کہ آخرت کا آنا واجب ہے' تو جب رسول اللہ ﷺ کی معرفت ہوگئی تو اس کی بھی ہوگئی' لہٰذا انہوں نے آگے آیت بیان نہیں کی آخرت کے وجوب پر۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو آپ لے سکتے ہیں' جیسے امام غزالی علیہ الرحمہ نے اس آیت سے استدلال کیا:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي

الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ (الحدید)

یہ آیت بھی کہاں سے شروع ہورہی ہے: اِعْلَمُوْا۔ امام غزالی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ اتنا علم حاصل کرلینا دنیا کی حقیقت کا کہ جس سے دنیا سے دلی تعلق ختم ہوجائے' دل سے دنیا کی محبّت رخصت ہوجائے' دنیا کے متاع الغرور ہونے پر کامل یقین حاصل ہوجائے اور اس کے نتیجے میں انسان کے دل میں ''التجافی عن دار الغرور والانابة الی دار الخلود'' کی حالت پیدا ہوجائے' اتنا علم حاصل کرلینا ضروری ہے۔ تو کہتے ہیں کہ دنیا کی معرفت بھی اتنی ضروری ہے جس سے دنیا کی محبّت ختم ہوجائے۔ تو یہ ایمان بالآخرۃ ہے۔ اس سے انہوں نے مزید استدلال یہ بھی کیا کہ تصوف کا علم یعنی کچھ باتیں جن سے دنیا کی حقیقت پتا چلتی ہے اور اللہ والوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں تو دنیا کی محبّت کم ہوتی ہے' تو ایسے کچھ ذرائع کا اختیار کرلینا بھی واجب ہوا کہ جس کے نتیجے میں دنیا کی محبّت مزید کم ہوجائے۔ تو یہ تین باتیں تھیں جس سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے تینوں کے لیے اعلم اور اعلموا کا صیغہ اختیار کر کے گویا اس امر کو واجب کر دیا۔ تو اب یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ کی معرفت' رسول اللہ ﷺ کی معرفت اور آخرت کے آنے کا کامل یقین' یہ وہ امور ہیں جو ہر مسلمان پر اولاً واجب ہیں' ان کا اقرار کرنا اور ان کی معرفت حاصل کرنا۔

یہ تو آیات قرآنیہ ہوگئیں' پھر امام بیہقی علیہ الرحمہ کچھ احادیث سے استدلال فرماتے ہیں' جو مشہور احادیث ہیں' آپ سب نے سنی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَاِذَا قَالُوْهَا عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا ' وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) (حدیث صحیح: مسلم' نسائی' ابن ماجه)

''مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے قتال کرتا رہوں' یہاں تک کہ یہ سب کہہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو جب یہ اس کلمہ کا اقرار کرلیں گے تو انہوں نے مجھ سے اپنا خون اور اپنا مال محفوظ کرلیا' اِلا یہ کہ اس کلمہ کے حق کے نتیجے میں دوبارہ لیا جائے! اور ان کا حساب اللہ عزّوجل کے ذِمّہ ہے۔''

وہ کلمہ کا حق کیا ہے؟ کوئی شخص مرتد ہوجائے' قتل کرے یا زنا کرے' تو پھر اسی ایمان کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے قصاص لیا جائے یا اس پر حد نافذ کی جائے۔ یہاں استدلال صرف اتنا مقصود تھا۔ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ لوگوں سے قتال ہی کرتے رہیں گے۔ اس آیت سے کچھ اہل ظاہر نے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی کافر کو دنیا میں باقی نہیں چھوڑنا' بلکہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کفر کا وجود ختم کر دینا۔ اور کفر کا وجود ختم کرنے کا مطلب ہے کافروں کا وجود ختم کرنا۔ تو یہ ایک بالکل غلط تفہیم ہے جو جمہورِ اُمّت کی تفہیم کے خلاف ہے۔ بلکہ بعض علماء نے ''النَّاس'' میں الف لام لِلْعَهْدِ مراد لیا ہے' یعنی النّاس سے مراد کُلُّ النَّاس نہیں' بلکہ المشرکین ہے' خاص طور پر مشرکینِ مکّہ

جن سے اسلام یا قتل کے سوا کچھ اور قبول نہیں تھا' یا یہ مراد ہے کہ جب میدان جنگ میں جنگ شروع ہو جائے تو تب تک قتال نہیں رکے گا جب تک وہ شکست نہ کھا جائیں یا اقرار نہ کرلیں۔ عموماً ہمارے جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ اسلام کا مقصد کافروں کو ختم کرنا نہیں بلکہ کفر کی سیادت و قیادت' ریاست اور اس کے غلبہ کو ختم کرنا ہے۔ یعنی ہمارے ہاں اتنی انقلابیت ضروری ہے کہ اسلام کفر کے غلبہ کا وجود نہیں چاہتا' یعنی اسلام یہ چاہتا ہے کہ کفر غلبہ نہ رکھے' غلبہ اسلام کا ہوگا' کافر اسلام کی چھتری کے نیچے اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں کچھ شرائط کے ساتھ۔ اگر مسلمان قوی ہوئے تو اس کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی کہ کفر دنیا میں اپنا سیاسی غلبہ برقرار رکھے۔ اس کا یہ بھی مفہوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کی چھتری تلے آجاؤ گے' جزیہ ادا کرو گے اور مسلمانوں کے ساتھ معاہدے میں شریک ہو جاؤ گے تو پھر تم اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہو' ورنہ بالکل مساوی ہو کر ریاست اور غلبہ کے ساتھ تم اپنا وجود نہیں رکھو گے۔

اس کے بعد ایک بہت خوبصورت حدیث ہے' اس سے استدلال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اللہ کے نبی ﷺ کہیں تشریف لے گئے اور کافی دیر ہوگئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خبر نہیں ہو رہی کہ آپ ﷺ کہاں چلے گئے۔ تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تلاش میں نکلے اور پھر وہ ایک نخلستان (کھجوروں کے باغ) میں پہنچے جہاں اللہ کے نبی ﷺ تشریف فرما تھے۔ وہ داخل ہوئے اور پھر اللہ کے نبی ﷺ نے انہیں اپنے نعلین مبارک دیے کہ ان کو لے جاؤ اور جو بھی تمہیں اس (باغ کی) دیوار کے پرے ملے جو دل سے یقین کامل رکھتے ہوئے یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اُسے جنّت کی خوشخبری دے دینا۔ وہ باہر نکلے تو پہلا آدمی جو انہیں ملا وہ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ سیّدنا عمرؓ نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے انہیں دھکا دیا اور ان کو پکڑ کر اللہ کے نبی ﷺ کے پاس لے گئے کہ یہ اس طرح کی باتیں کر رہا ہے کہ جو لا الٰہ اِلا اللہ کہتا ہے اس کو جنّت کی خوشخبری دے دو۔ سیّدنا عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ تو پھر اسی پر تکیہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے کہا کہ رہنے دو نہ بتاؤ۔ ایک روایت میں سیّدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ قالها عند موته تأثما۔ انہوں نے اپنی موت کے موقع پر یہ بات بتادی کہ مجھے گناہ نہ ہو جائے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے ایک بات بتائی تھی اور میں اس کو چھپالوں تو کہیں علم کو چھپانے کی وعید مجھ پر صادق نہ آجائے۔ لہٰذا انہوں نے بتادی۔ تو وہ بھی کیا گواہی تھی۔ اللہ کے نبی ﷺ کا کہنا تھا:

((اِذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ' فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ)) (۱)

بس ایک اضافی بات اس میں ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہتا ہو دل سے یقین کامل رکھتے ہوئے :((فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ)) تو اُسے جنّت کی خوشخبری دے دو! اس سے امام بیہقی علیہ الرحمہ نے کیا استدلال کیا۔

امام بیہقیؒ نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا کہ پہلی حدیث میں تو بس یہ تھا کہ حتیٰ یقولوا 'بس کہہ دیں لااله الا الله' وہاں شرط نہیں تھی مستيقنًا بها قلبه کی' تو پتا چلا کہ (جنت میں داخلے کے لیے) مستيقناً بها

(۱) صحيح مسلم' كتاب الايمان' باب الدليل على ان من مات على التوحيد دخل الجنة قطعًا۔ ح:۳۱

قلبہ کی شرط لازم ہے۔ کیونکہ وہاں بات تھی اپنا خون اور اپنا مال بچانے کی تو اس میں یقینِ قلبی تو نہیں دیکھا جائے گا‘ جو بھی لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے اُس کی جان‘ اُس کا مال‘ اُس کی عزّت سب محفوظ ہو جائے گا۔ لیکن یہاں بات ہو رہی ہے جنّت میں داخلے کی۔ کیونکہ یہاں الفاظ ہیں: فبشرہ بالجنۃ‘ تو جنّت میں داخلے کے لیے کیا محض قول لا الہ الا اللہ کافی ہے؟ یقیناً کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ قول تو منافقین کے منہ سے بھی نکلتا تھا۔ وہ بھی کہتے تھے: لاالہ الا اللہ! قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ﴾ (المنٰفقون:۱)

’’جب یہ منافق آپؐ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔‘‘

تو ہمیں یہ معلوم ہوا کہ جن احادیث میں صرف قول پر جنّت کی خوشخبری دی گئی ہے اس میں محض قول مراد نہیں ہے‘ بلکہ ساتھ یقینِ قلبی کی شرط ہے۔ لہٰذا ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) سے بھی مراد یہی ہے کہ ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) جو اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ اس کا دل یقین رکھتا ہو۔

اللہ کے نبی ﷺ کی تیسری حدیث ہے۔ فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) ’’جس کو موت اس حالت میں آ گئی کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا۔‘‘ (حدیث صحیح: مسلم‘ نسائی‘ احمد)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ پہلی حدیث میں حَتّٰی يَقُوْلُوْا گویا دنیا میں اپنے جان و مال کی حفاظت ہے۔ دوسری حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ بتا رہے ہیں کہ ایمان کی شرط کیا ہے‘ وہ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ ہے۔ اور تیسری حدیث میں جنّت میں داخلے کے لیے ایک اضافی شرط بھی ہے کہ یہ یقینِ قلبی موت تک رہے اور موت بھی اس حالت میں واقع ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک شخص کو زندگی کے پانچ سالوں میں یقینِ قلبی حاصل ہوا‘ پھر نعوذ باللہ وہ رخصت ہو گیا‘ تو اب وہ کہے کہ مجھے بھی پانچ سال یقینِ قلبی حاصل ہو گیا تھا تو میں اس بشارت کا مصداق ہوں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نہیں! ایمان پر خاتمہ بھی شرط ہے۔ اور کانٹے کی بات یہی ہے۔ جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطرہ ہوتا تھا وہ یہی بات تھی۔ ایک صحابی فوت ہو رہے تھے‘ اُن کے پاس کچھ لوگ گئے تو وہ رو رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ رو رہے ہیں‘ آپ اللہ کے نبی ﷺ کے صحابی ہیں‘ آپ نے جہاد کیا‘ قتال کیا‘ دین کی نصرت کی‘ آپ نے یہ سب کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے گناہوں کا بھی اندیشہ نہیں ہے‘ مجھے اصلاً سوئے خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ یعنی عین موت کے وقت جو سکرات ہیں اور نزع کی کیفیت ہے اس میں ایسا نہ ہو کہ میرا کوئی ایسا گناہ جو میرے ذہن میں بھی نہ ہو وہ کسی طریقے پر میرے اوپر ایسا حاوی ہو جائے کہ منہ سے یا دل میں کلمہ کفر کا کوئی اعتقاد پیدا ہو جائے۔ تو مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ‘ اس حال میں موت آئے۔ تو یہ دخولِ جنّت کی شرطِ لابدی ہے۔ اس لیے اللہ کی نبی ﷺ کی جو دعائیں ہیں ان میں سے ایک دعا یہ ہے کہ ((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ حُسْنَ

الْخَاتِمَةِ)) ''اے اللہ! میں تجھ سے حسن خاتمہ کی درخواست کرتا ہوں''۔ اور ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ سُوْءِ الْخَاتِمَةِ)) ''اے اللہ! میں تجھ سے سوء خاتمہ سے پناہ مانگتا ہوں۔''

سوء خاتمہ اور حسن خاتمہ کی قرآن مجید میں بھی مثال موجود ہے اور بہت بلیغ مثال ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ہے جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ ایک حلقہ تدریس منعقد فرمایا۔ وہ آیت ہے:

﴿اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِیْهَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْکِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۪ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾﴾

''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' جس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں' اس کے لیے اس باغ میں ہر طرح کے پھل ہوں اور اس پر بڑھاپا طاری ہو جائے جبکہ اس کی اولاد ابھی ناتواں ہو۔ اور عین اُس وقت اُس باغ پر ایک ایسا بگولا پھر جائے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جھلس کر رہ جائے؟ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس مثال میں اشکال محسوس ہوا۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا تو مختلف لوگوں نے مختلف آراء بیان کیں۔ سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس میں سوء خاتمہ کی مثال ہے۔ یعنی ایسا شخص بوڑھا ہو چکا ہے' اُس کا باغ ہے' بچے ابھی چھوٹے ہیں' تو اُس وقت اس کو سب سے زیادہ حاجت ہے اپنے باغ کی اور عین اسی موقع پر باغ جل گیا۔ تو اسی طرح جب انسان دنیا سے رخصت ہو رہا ہے تو اُس نے جو تیس چالیس پچاس سال کی کمائی کی ہے نیکیوں کی' ایمان کی' سب سے زیادہ حاجت اسے اب ہے اور عین اسی موقع پر نیکیوں اور ایمان کا باغ جل جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی اَلمیہ نہیں ہو سکتا۔ تو اسی لیے اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اور یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ امام حسن بصری علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ انسان کی وفات اُسی شے پر ہوتی ہے جس پر اُس نے زندگی گزاری ہے۔ اگر وہ اپنے ایمان میں دھوکے باز تھا (نعوذ باللہ!) تو اُس کی موت کے موقع پر یہ پردہ اُٹھ جائے گا اور یہ ماسک اُتر جائے گا۔ اور اگر وہ ایمان میں سچا تھا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے بالکل یہی اُمید ہے کہ اُس کی موت بھی ایمان کی حالت میں ہی ہوگی۔ بہرحال انہوں نے تیسری حدیث یہ بیان کی۔

پھر امام بیہقیؒ چوتھی حدیث بیان کرتے ہیں کہ سب سے اعلیٰ ایک درجہ یہ ہو سکتا ہے کہ آخر میں موت کے موقع پر علم کے ساتھ ساتھ منہ پر یہ کلمہ جاری ہو جائے۔ اگر موت کے موقع پر آخری کلمہ لا الہ الا اللہ نصیب ہو جائے تو یہ گویا اس بات کی علامت ہے کہ یہ حسن خاتمہ ہے۔ سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ کَانَ آخِرُ کَلَامِهٖ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ)) ''جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو گیا جنّت اس پر واجب ہو گئی۔'' (حدیث حسن: ابوداؤد' احمد)

گویا اس میں ایک اور بات کی طرف اشارہ ہے۔ علماء نے کہا کہ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ دل سے یقین رکھتا

ہو۔اس لیے کہ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے (واللہ اعلم!) کہ موت کے موقع پر جس کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہوجائے گا' قوی اُمید اور گمانِ غالب یہی ہے کہ ایسے شخص کے دل میں بھی ایمان موجود ہے۔اگر اُس کے دل میں ایمان موجود نہ ہوتا تو نزع کی حالت میں سکراتِ موت کی کیفیت میں اُس کی زبان پر یہ کلمہ کیسے جاری ہوجاتا۔تو گویا یہ علامت ہے۔اللہ کے نبی ﷺ نے درست فرمایا کہ آخری کلام اگر یہ ہوگیا تو اُس پر جنّت واجب ہے۔اسی لیے اللہ کے نبی ﷺ نے تلقین فرمائی ہے کہ ((لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) ''اپنے قریب الموت حضرات کو لا اِلٰہَ الا اللہ کی تلقین کیا کرو''۔(صحیح مسلم' کتاب الجنائز) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علماء نے تلقین کا طریقہ یہ بتایا کہ اس کے پاس اس کلمہ کو بلند آواز سے پڑھا جائے۔اس کو کہا نہ جائے کہ پڑھو کیونکہ جس کیفیت میں وہ ہے' بار بار اسے کہنے کے نتیجے میں وہ (نعوذ باللہ) کہہ دے کہ نہیں! تو وہ خطرناک بات ہے۔البتہ جو لوگ اس کے پاس ہیں بلند آواز میں کہہ رہے ہوں ''لا الٰہ الا اللہ'' تاکہ وہ سن لے اور اس کے دل میں بھی یہ بات حاضر ہوجائے کہ مجھے یہ کلمہ اس وقت کہہ دینا چاہیے۔تو امام بیہقیؒ نے اس بات پر اس کتاب کا پہلا باب مکمل کیا ہے۔

اس میں انہوں نے یہ بات بیان کی کہ پہلا واجب ہے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت' اور اس معرفت کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کی معرفت' اور جو باتیں رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہیں ان سب پر یقین حاصل کیا جائے دلیل کے ساتھ۔رسول اللہ ﷺ ہمیں صرف اخلاقی تعلیمات ہی نہیں دیتے' بلکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور تعارف کرواتے ہیں' تاکہ عقیدے کی وجہ سے عمل کی صحیح بنیاد استوار ہو۔

---------- (۲) ----------

(ترتیب کے اعتبار سے یہ لیکچر نمبر ۱۶ ہے' مگر چونکہ کچھ بنیادی
ضروری مباحثِ عقیدہ کا احاطہ کرتا ہے اس لیے شروع میں دیا جارہا ہے)

خطبہ مسنونہ اور تلاوت آیات کے بعد!

آج کچھ ضروری بنیادی مباحثِ عقیدہ کا احاطہ مقصود ہے۔کوشش کی جائے گی کہ علم عقیدہ جو کہ ایک کامل فن ہے' اس کی اصطلاحی تعریف اس طریقے پر بیان کی جائے کہ اس فن کی بنیاد' ثمرہ اور غایت کی وضاحت ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ کائناتِ علوم میں اس علم عالی واشرف کا کیا مقام ومرتبہ ہے اور علماء نے کن کن عنوانات سے اسے مُعَنْوَنْ کیا ہے' اس کی کیا کیا تعریفات کی گئی ہیں اور اس پر کون کون سے اعتراضات کیے گئے ہیں اور علماءِ عقیدہ و کلام نے ان کے کیا کافی ووافی جوابات دیے ہیں۔ان سب باتوں کا اگر علم ہوجائے تو بہت ہی مفید ہوگا۔

علماء نے کہا ہے کہ علم عقیدہ کے ایک سے زیادہ نام ہیں' مثلاً: علمِ کلام' علمِ توحید' علمِ اصولِ دین۔امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے ہاں اس کا نام تھا: الفقہ الاکبر۔یعنی اس علم کو سب سے پہلا جو نام دیا گیا وہ الفقہ الاکبر کا ہے اور وہ امام صاحبؒ کے بعض رسائل میں پایا جاتا ہے۔جیسے الفقہ الاکبر ان کا ایک متن بھی ہے' اگرچہ اس متن کے حوالے سے کچھ لوگوں کو اعتراض ہے کہ شاید اس کی نسبت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی طرف ثابت نہیں ہے' لیکن

محققین نے کہا ہے کہ نسبت ثابت ہو یا نہ ہو لیکن یہ تمام مضامین اور معانی و مفاہیم امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے مختلف طریقوں پر مروی ہیں۔ تاہم اکثر علماء نے اس کے ثبوت کا اقرار کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تعریف کیا ہے؟ یعنی اس کی اصطلاحی اور درسی تعریف علماء نے کیا کی ہے؟ بہت سی تعریفات ہیں، لیکن علماء نے تمام تعریفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ کہتے ہیں آپ نے کسی بھی فن کی جب تعریف کرنی ہو تو وہ تعریف کبھی تو بلحاظ موضوع ہوتی ہے، اور کبھی بلحاظِ ثمرہ یا غایت ہوتی ہے کہ اس سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی علم کی تعریف کرنے میں یہ دو مناہج ہیں کہ کبھی آپ اس کا موضوع اس کی تعریف میں بیان کر دیتے ہیں اور کبھی آپ اس کا فائدہ بیان کرتے ہیں۔ تو ان دو مناہج پر بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن ان میں سے مَیں نے تین تعریفات کا انتخاب کیا ہے۔

ایک مشہور تعریف ہے عضد الدین الایجی علیہ الرحمہ کی، جو بہت بڑے متکلّم تھے، جن کی چار پانچ جلدوں میں ''شرح مواقف'' بہت مشہور کتاب ہے۔ وہ فرماتے ہیں: هو علم يقتدر معه على اثبات العقائد الدينية على الغير بايراد الحجج و دفع الشبه ''علم کلام وہ علم ہے جو عقائد دینی کو مستحکم طور پر ثابت کرنے کے لیے دلائل دینے اور شبہات کا ازالہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے''۔ یعنی اگر آپ یہ علم تفصیل کے ساتھ حاصل کر لیں تو اس کے ساتھ آپ کو دلائل کے ساتھ دینی عقائد کو ثابت کرنے اور ان پر وارد شبہات کا ازالہ کرنے پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے شبہات کو دور کیا جاتا ہے، شبہات کی نفی ہوتی ہے۔ تو انہوں نے بس ایک پہلو بیان کیا کہ شبہات کی نفی اور عضد الدین الایجی نے کہا کہ صرف شبہات کی نفی نہیں، بلکہ عقائد دینیہ کا اثبات بھی ہوتا ہے۔ اور اگر ہم دیکھیں تو بات ایک ہی ہے، جو علم شبہ کی نفی کرے گا وہ یقیناً کسی صحیح عقیدہ کا اثبات بھی کرے گا۔ یعنی شبہ کی نفی بھی صحیح عقیدہ کے اثبات کو مستلزم ہے۔ تو اس اعتبار سے ان تعریفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

پھر ایک تعریف ہوتی ہے بلحاظ موضوع، اس میں فائدے کا بیان نہیں ہو رہا ہوتا، بلکہ بتایا جاتا ہے کہ یہ علم کن مسائل سے بحث کرتا ہے۔ یعنی کسی بھی علم کا موضوع وہ مسائل ہوتے ہیں جن کے بارے میں وہ علم گفتگو اور بحث کرتا ہے۔ چنانچہ امام رازی علیہ الرحمہ اور دوسرے متکلمین سے مروی ہے کہ هو علم يبحث فى الوجود ''یہ وہ علم ہے جس کا موضوعِ بحث الوجود ہے''۔ یہ بہت مختصر تعریف ہے، لیکن اس کی علماء نے تشریح کی ہے کہ الوجود علم کلام یا علم دین یا اصولِ دین یا عقیدہ کا موضوعِ بحث کیسے بنے گا۔ انہوں نے کہا کہ الوجود سے مراد ہے وجود پر غور کر کے وجود کی تقسیمات کر دی جائیں: ممکن الوجود اور واجب الوجود۔ یہ الوجود کی تقسیم ہے۔ تو واجب الوجود کا اثبات ہوگا، ممکن الوجود کو واجب الوجود کی حاجت ہوگی تو واجب الوجود کی صفات اور اُس کے افعال کا بیان ہوگا۔ اور افعال میں سے ایک فعل ہے رسول کا بھیجنا۔ اور اس طریقے پر ہم تمام عقائد دینیہ کو ثابت کر دیں گے، لیکن بات شروع ہو رہی ہے: علم يبحث فى الوجود۔ اعتراض کیا گیا کہ یہی کام تو فلاسفہ بھی کر رہے ہیں، وہ بھی وجود کے بارے ہی گفتگو کر رہے ہیں، تو فرق کیا ہے؟ عضد الدین الایجی فرماتے ہیں کہ علم کلام اور فلسفہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ الوجود میں گفتگو کر

رہے ہیں لیکن ہم علم الکلام کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ علم یبحث فی الوجود علی قانون الشرع یعنی ہم قانونِ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے وجود پر بحث کریں گے تو یہ علمِ کلام شمار ہوگا۔ یعنی علمِ کلام یا علمِ اصولِ دین قانونِ شریعت کے قانون کے اندر رہ کر کسی شے کا اثبات ہے۔ یہ محض ایسی نظری بحث نہیں ہے کہ جو محض عقل کے قوانین کے تابع ہو کر رہ جائے بلکہ عقل کے ساتھ ساتھ شریعت کے بھی تابع ہوگی۔ تو یہ بھی ایک تعریف کی گئی ہے۔ جب یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ تعریف شاید کچھ شبہات پیدا کرے کہ وجود میں کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ ہم نے تو سنا ہے کہ یہ علمِ عقائد دینیہ کا اثبات ہوتا ہے، ہم نے تو کبھی ''ایمان بالوجود'' نہیں سنا، تو کچھ لوگوں نے اس کو کھول کر یوں بیان کر دیا کہ علم یبحث عن اثبات وجود اللّٰہ واوصافہ وافعالہ ''وہ علم جو بحث کرتا ہے اللہ کے وجود کے اثبات میں اور اس کی صفات اور افعال میں''۔ تو یہ پورا علم ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس علم میں تو صرف الٰہیات آئی ہیں، نبوات اور سمعیات کہاں گئیں؟ حالانکہ انہیں بھی ہم نے علمِ عقیدہ میں شمار کیا ہے۔ تو کہا کہ ''افعالہ'' ہی میں سے رسالت بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے بہت سے افعال ہیں، خلق ہے، رزق ہے، احیاء ہے، اماتہ ہے وغیرہ، تو ان میں سے ایک ارسالِ رسل بھی ہے۔ لہٰذا یہ ساری بحث اصلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات وصفات وافعال کی بحث ہے۔ پورے کا پورا دین یہ ہے۔

تیسری تعریف امام کمال الدین البیاضی علیہ الرحمہ کی ہے۔ ان کی ایک مشہور کتاب ہے: اشارات المرام فی عبارات الامام۔ احناف کے ہاں جو عقیدہ کی تعلیم ہوتی ہے ماتریدی طریقے پر اس میں یہ کتاب امہات الکتب میں شمار ہوتی ہے۔ الامام سے مراد امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ ہیں۔ یہ کتاب ''الاشارات للبیاضی'' کے نام سے مشہور ہے اور اس میں امام ابوحنیفہؒ سے عقیدے میں جتنی بھی عبارتیں مروی ہیں ان کی وضاحت اور ان کی شرح ہے کہ کہاں اختلاف ہے اور کہاں نہیں ہے۔ وہ اس علم کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی تعریف بیان کرتے ہیں جو بہت مشہور ہے۔ ان کے ہاں فقہ کی تعریف ہے: معرفۃ النفس مالھا وما علیھا یعنی نفس کی معرفت کہ اس کے لیے کیا جائز ہے اور کیا اس کے تزکیہ اور پاکیزگی کے خلاف ہے۔ یہ بس کُل فقہ ہے۔ اس میں ''الفقہ الاکبر'' بھی شامل ہے اور اس میں ''الفقہ الاصغر'' بھی جس کو ہم ''فقہ'' کہتے ہیں۔ لیکن یہاں انہوں نے امام صاحب علیہ الرحمہ کی ذرا تفصیلی عبارت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اعلم ان الفقہ فی اصول الدین افضل من الفقہ فی فروع الاحکام۔ یہ ایک قاعدہ بیان کر دیا کہ اصولِ دین میں تفقہ حاصل کرنا افضل ہے فروعِ دین میں تفقہ سے۔ گویا یہاں سے امام صاحب علیہ الرحمہ ایک تقسیم بیان فرما رہے ہیں کہ یہ جو علم کلام، علم عقیدہ ہے، علم اصولِ دین ہے یہ فروعاتِ فقیہہ سے افضل ہے۔ یعنی ''اوّل الذکر'' موخّر الذکر سے افضل ہے۔

وہ مزید فرماتے ہیں: والفقہ ھو معرفۃ النفس ما یجوز لھا من الاعتقادیات والعملیات وما یجب علیھا منھا۔ کہہ رہے ہیں کہ (کُل کا کُل دین یہ ہے کہ) نفس کی معرفت ہو جائے کہ اس کے لیے کیا اعتقادیات اور عملیات جائز ہیں اور کیا واجب ہیں۔ یہ علم حاصل کر لینا گویا کُل کا کُل دین اور کُل کی کُل فقہ ہے۔ تو یہ بہت جامع عبارت ہے۔ اس کی بعض علماء نے شرح یوں کی کہ گویا نفس کی معرفت میں سب سے پہلی معرفت یہ شامل

ہے کہ میرا نفس عبد ہے یعنی عبودیت کی معرفت اور اس کے بعد عمل کی معرفت۔ عمل دو قسم کے ہیں۔ یا تو عملِ قلب یعنی اعتقاد ہے، یا عملِ جوارح ہے۔ تو عمل قلب میں کیا ماننا ہے کیا نہیں ماننا، یہ اصولِ دین ہے۔ اور عمل میں کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا، یہ فروعِ دین ہے۔ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ اعمالِ قلبیہ افضل ہیں یعنی عملِ جوارح سے عملِ قلب افضل ہے، لہٰذا عقیدہ پہلے ہوگا عمل بعد میں آئے گا۔ اور عقیدہ درست نہیں ہے تو عمل قبول نہیں ہے۔

پھر مزید وضاحت فرماتے ہیں: وما یتعلق منها بالاعتقادیات هو الفقه الاکبر وما یتعلق بالعملیات فهو الفقه کہ جو علم ان میں سے اعتقادیات سے تعلق رکھتا ہے اس کو ہم الفقہ الاکبر کہتے ہیں اور جو علم وابستہ ہے عملیات سے اس کو ہم فقہ کہتے ہیں۔ یعنی آج کل جو ہماری ''فقہ'' کی اصطلاح ہے وہ اس معنیٰ میں بولی جاتی ہے اور الفقہ الاکبر کے لیے، جیسے مَیں نے آپ کو بتایا، علمِ اصولِ دین، علمِ کلام، علمِ عقیدہ یا علمِ توحید کی اصطلاحات شائع ہیں۔ تو امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے ہاں اس کی تعریف سے گویا ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ علمِ عقیدہ عمل سے بحث نہیں کرتا اور عمل سے مراد عملِ جوارح ہے۔ ہاں اگر ہم عمل کو ایک وسیع معنیٰ میں لے لیں تو عملِ قلب سے ضرور بحث کر رہا ہے کہ آپ نے اپنے قلب میں یا اپنے ذہن میں کیا عقیدہ رکھنا ہے، کیا ماننا ہے، کیا نہیں ماننا، اور کیسے ماننا ہے، اس کے دلائل کیا ہیں؟ اور اگر ان دلائل پر کچھ شبہات وارد ہوتے ہیں تو ان شبہات کا جواب کیسے دینا ہے؟ اس پورے علم کلام کے اندر کچھ باتیں طے شدہ ہیں۔ ایک طے شدہ بات جو سب متکلّمین کے ہاں متفق علیہ ہے وہ یہ ہے کہ عقائد پر صحیح عقلی دلیل قائم ہو سکتی ہے، یعنی یہ بنیادی مفروضہ (basic assumption) ہے کہ جو بھی عقیدہ ہے، چاہے اللہ کا وجود ہو یا نبی کی رسالت کا اقرار ہو، یہ صحیح عقلی دلیل کا مدلول بن سکتے ہیں۔ یہاں متکلّمین کا منہج علمی یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کچھ بدیہی علوم عطا فرمائے ہیں۔ وہ بدیہی علوم (یا وجدانی بصیرتیں) وہ دلائل عقلیہ ہیں کہ جو نظری نہیں ہیں، یعنی غور و فکر کر کے معلوم نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر قانونِ تناقض (law of contradiction) ان کے ہاں ایک ایسا عقلی قانون ہے کہ جس کو مزید ثابت نہیں کرنا ہوتا، کیونکہ اگر ثابت کرنا پڑے تو وہ نظری ہو جائے گا۔

بدیہی اور نظری کی تقسیم کیا ہے؟ بدیہی اُس شے کو کہتے ہیں جس چیز کا تصوّر ہی اُس کا علم دے دے۔ اور نظری وہ ہے کہ تصوّر کے ساتھ کچھ دلیل قائم کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ ''الکُلّ اعظم من الجزء''۔ اگر کُل اور جزء کا صرف تصوّر قائم ہو جائے گا تو یہ قضیہ خود بخود صادق ہو جائے گا اور اس کے لیے مزید دلیل نہیں چاہیے۔ اور نظری کی مثال یہ ہے کہ اگر کہیں کہ اللہ موجود ہے تو یہ بدیہی نہیں ہے، اس کے لیے دلیل چاہیے ہوگی۔ اگرچہ کچھ علماء نے اس کو بدیہی کہا ہے لیکن اکثر متکلّمین کے نزدیک یہ محتاجِ دلیل ہے۔ گویا پھر ان کی علمیات (Epistemology) کو ہم عقلی کہہ سکتے ہیں۔ وہ اس اعتبار سے کہ وہ عقل کے کچھ بنیادی قوانین مانتے ہیں جن پر عقل کھڑی ہو کر غور و فکر کرتی ہے اور کچھ نتائج تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور پھر قرآن و حدیث سے اس کے دلائل بھی دیے ہیں۔

یہاں سے ہمیں ایک اہم بات معلوم ہو رہی ہے، کیونکہ آج کل کہا جاتا ہے، آج کا دور یہ ہے کہ عقل ختم ہوگئی۔ مطلب یہ کہ کس کی عقل پر گفتگو ہوگی؟ کون سی عقل کیسی عقل؟ تو پھر ہم نے بھی چھوڑ دیا کہ عقلی دلائل کو چھوڑو۔ کیونکہ

یہ جو پرانے فلسفیانہ عقلی دلائل تھے ان کو اب کوئی نہیں مانتا' لہٰذا چھوڑ دینا چاہیے! تو یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ مَیں نے کسی بڑے متکلم کو نہیں دیکھا جو اس بات کا قائل ہو۔ جو لوگ بھی اس کا نعرہ لگاتے ہیں وہ دراصل علم الکلام کو جانتے نہیں ہیں یا اس کے پیچھے کوئی اور مقاصد ہوتے ہیں۔ یعنی جو بھی بڑے متکلم گزرے ہیں اور کچھ جو آج بھی موجود ہیں اور یقیناً جدید دنیا اور جدید مسائل سے واقف ہیں' ان میں سے کسی نے آج تک یہ نہیں کہا کہ پرانا علم الکلام out dated ہے' لہٰذا اس کو چھوڑ دینا چاہیے' اس کو اٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دینا چاہیے' اور پھر کچھ نیا علم الکلام بناؤ۔ عموماً جو لوگ نئے علم الکلام کے دعویدار ہیں' قدیم علم الکلام کو نہ انہوں نے پڑھا ہے نہ ہی غالباً وہ پڑھ سکتے ہیں۔ انہیں کہا جائے کہ امام رازیؒ کی کتاب ''المطالب العالیہ'' ذرا پڑھ کے دکھاؤ تو وہ بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ ایک صاحب مصر سے آئے ہوئے تھے جو ڈاکٹر تھے' ان سے ایک دفعہ بات ہوئی۔ وہ بہت دعویٰ کر رہے تھے کہ نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے متقدمین میں سے کسی کو پڑھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ضرورت ہی نہیں ہے پڑھنے کی' ان کو پتا ہی کیا تھا؟ یعنی پرانے لوگوں نے فضول باتیں کی ہیں اور انہوں نے کوئی کام نہیں کیا' اس لیے نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔ بہرحال پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ قول کس کے منہ سے برآمد ہو رہا ہے' پہلے ہم اس کو جا کے دیکھیں گے کہ اُس کو کچھ پتا بھی ہے یا نہیں! آج جدید علم الکلام کے ایسے دعویدار بھی پیدا ہو گئے ہیں کہ عربی زبان بھی نہیں جانتے۔ انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ ہمارے متکلمین کیا کہتے رہے ہیں' ہماری کیا روایت ہے' کیا تراث ہے۔ تو پڑھے بغیر یہ دعویٰ کر دینا جہالت کی معراج ہے کہ یہ علم الکلام out dated ہے۔ تو پہلے آپ پڑھیں' اس کے بعد دعویٰ کریں' اور صرف پڑھیں نہیں' بلکہ پہلے سمجھیں! کیونکہ امکان یہ ہے کہ شاید آپ سمجھ بھی نہ سکیں۔ کیونکہ آپ کے اوپر تو ڈپریشن کی کیفیت طاری ہو جائے گی جب آپ امام رازی کی ''المطالب العالیہ'' یا ''نہایت العقول'' کھول کے بیٹھ جائیں اور اس کے پہلے دس صفحات میں سے آپ کو بس دس فیصد سمجھ آ رہا ہو۔ تو پہلے آپ سمجھ تو لیں۔ جیسے منطق میں کہتے ہیں کہ الحکم علی الشیء فرع عن تصورہ۔ کسی شے پر حکم لگانے سے پہلے پوری طرح اس کو conceptualize کرنا ہوگا' پھر اس کے بعد حکم لگے گا۔ تو تصوّر ہے نہیں' پتا کچھ نہیں ہے اور حکم لگا رہے ہیں' تو یہ اعلیٰ درجے کی جہالت ہے۔

متکلّمین نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو طرقِ عقلیہ اور دلائل کلامیہ ہم نے بیان کیے ہیں وہ کُل کے کُل دلائل ہیں اور اس کے سوا خدا کے وجود تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ایسا یقیناً نہیں ہے' اور بھی ذریعے ہیں۔ امام بیہقی علیہ الرحمہ کی کتاب ہی میں ہم نے دیکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کچھ متکلمین عقلی دلائل استعمال کرتے ہیں' کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت ثابت کر کے اس کے ذریعے خدا کا وجود ثابت کر دیں گے' کچھ عقل کو مخاطب کریں گے' کچھ انسانی طبیعت کو مخاطب کریں گے۔ صوفیاء کا ایک پورا ڈسکورس موجود ہے' وہ کچھ اور ذرائع سے انسان کو مخاطب کریں گے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ متکلّمین نے کہا ہو کہ بس عقلی دلیل سے ہی اثبات ہوتا ہے۔ البتہ انہوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ عقلی دلیل سے بھی اثبات ہوتا ہے۔ اور بھی ذرائع ہیں جن کا انکار نہیں۔ ایک بڑے متکلّم کی میں مثال دیتا ہوں جو

جدید وقدیم دونوں کو جانتے تھے اور انہوں نے قدیم پر کھڑے ہو کر جدید کا ردّ کیا اور وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ اس قدیم پر کچھ بڑے دلائل کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اضافے کے قائل ہیں۔ علم الکلام مستقل حرکت میں رہنے والا علم ہے جس میں جدید دلائل اور جدید علوم سے استفادہ ہوتا رہے گا۔ تو وہ تھے شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری علیہ الرحمہ جو بہت بڑے عالم تھے۔ وہ خلافتِ عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام تھے اور پھر وہاں سے مصر تشریف لے آئے اور اُس وقت مصر میں جدّت پسندی کا دور تھا۔ مفتی محمد عبدہ علیہ الرحمہ سے جو ایک جدّت پسندی شروع ہوئی' ان کے کچھ شاگرد اور متاثرین اس وقت موجود تھے' ان پر شدید ردّ کیا اور ایسا رد کہ لگتا ہے کہ ایک جانب دیو کھڑا ہے اور اس کے سامنے بونے کھڑے ہیں۔ یعنی محسوس ایسے ہوتا تھا کہ مصطفیٰ صبری کی کیا شخصیت ہے اور کیا علوم پر گرفت ہے' خصوصاً عقلی علوم پر۔

اس زمانے میں جامعہ ازہر سے انہی جدید اثرات کی وجہ سے نئے علم الکلام کا نعرہ بلند ہو رہا تھا اور پرانے دلائل بے وقعت ہو چکے تھے اور عقل' منطق' پرانا فلسفہ اور پرانے علم الکلام پر گرفت کمزور پڑتی چلی جا رہی تھی۔ لہٰذا مصطفیٰ صبری کے مقابلے میں وہ لوگ کسی جگہ پر بھی نہیں کھڑے تھے۔ تو ایک عظیم الشان کتاب انہوں نے تحریر کی جس کا عنوان ہے: موقف العقل والعلم والعالم من کلام ربّ العالمین وعبادہ المرسلین - چار جلدوں میں ضخیم کتاب' پڑھنے والی کتاب ہے۔ تو وہ متکلم تھے۔ کانٹ نے خدا کے جن جن دلائل پر اعتراضات کیے ہیں تو مصطفیٰ صبری اپنی منطق اور اپنے علم الکلام پر کھڑے ہو کر اس کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ یعنی ہمارے ہاں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جس مسئلے پر ایک دفعہ کسی نے رد کر دیا تو وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ تو رد تو ہر وقت ہوتا رہے گا' لہٰذا صرف یہ کہہ لینا کہ فلاں بڑے فلسفیوں نے دلائل کو رد کر دیا ہے لہٰذا یہ دلائل out dated ہو گئے' یہ عجیب وغریب تصوّر ہے۔ ٹھیک ہے اس نے رد کر دیا' اس کے بعد کچھ لوگوں نے مزید اس پر بھی ردّ کیا ہے تو وہ اتنے مشہور نہیں ہو سکے۔ اس لیے کہ وہ جس لغت میں گفتگو کر رہے تھے وہ لغت اب سمجھ میں بھی نہیں آتی اور نہ ان کا کوئی تعارف ہے۔

بہر حال مصطفیٰ صبری کے علاوہ جدید ناموں میں جو شخص علم الکلام پر مہارت رکھتا ہے' بہت بڑا نام ہے' بے شمار کتابوں کا مصنف ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں متکلم ہے اور جدید پر نگاہ ہے' علامہ سعید فودہ۔ سعید فودہ علم الکلام کو یقیناً ایک حرکی علم مانتے ہیں' لیکن انہی بنیادوں پر کھڑے ہو کر اور قدیم کا انکار کیے بغیر۔ انہیں علم الکلام پر انتہائی غایت درجے کی مہارت حاصل ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں ہیں جن کا الگ سے میں تعارف کرواؤں گا کہ انہوں نے کیا کیا اس موضوع پر لکھا۔ بہر حال ہمیں تو پتا ہی کچھ نہیں۔ ہم بس بند کمرے میں بیٹھ کر دعویٰ کر دیتے ہیں کہ علم الکلام اب پرانا ہو گیا ہے۔

مغرب میں بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو اثباتِ وجود خدا کے لیے ہمارے روایتی کلامی دلائل کا استعمال کر رہے ہیں' جیسے ولیم لین گریگ' وہ اس وقت کلامی cosmological argument کی تشہیر کر رہے ہیں۔ علم الکلام کے نتیجے میں جو علم العقائد وجود میں آیا اس کے تین حصے ہیں۔ ایک ہے بیانِ عقائد' ایک ہے اثباتِ عقائد اور ایک ہے شبہات کی نفی۔ علم الکلام یا علم العقیدہ کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ قطعیات ہوتی ہیں اور کچھ ظنیات ہوتی

ہیں۔تو نئے علم الکلام کے بہت سے دعوے داروں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ قطعیات کو ظنیات بنانا چاہتے ہیں۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ وہ دین سے بہت مخلص ہیں‘ بہت زیادہ دین کا اثبات چاہتے ہیں۔ یقیناً کچھ ایسے بھی ہوں گے‘ لیکن بہت سے لوگوں کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ علم الکلام نے آ کر ان کے لیے اجتہادِ مطلق کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اجتہادِ مطلق کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے ہاں دین میں اور علم الکلام میں جو قطعیات ہیں یہ بھی قطعیات نہ رہیں‘ یہ بھی questionable ہو جائیں اور ان میں بھی کچھ ظن کی گنجائش پیدا ہو جائے‘ مگر علم الکلام اس مسئلہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔یعنی آپ دیکھیں کہ یہ جو عقیدہ کا بیان ہے یا اصولِ دین کا بیان ہے‘ جب ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ یہ اصولِ دین ہیں جن میں تغیر نہیں ہو سکتا تو یہ لوگ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں اصولِ دین کیا چیز ہوتی ہے؟ دین تو ایک چلتا پراسس ہے‘ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں‘ اصولِ دین کوئی شے نہیں ہے۔لہٰذا آپ دیکھ لیں بہت سے جدید علم الکلام کے دعویداروں نے اصولِ دین اڑا کر رکھ دیے۔انہوں نے نبی کی ایسی نئی نئی تعریفیں بنالی ہیں‘ نبوت کو کسبی بنا دیا۔یعنی نبی کی ایسی تعریف بنالی جس کے نتیجے میں نبی بھی ایک عام آدمی ہے‘ بس اس پر خاص ریاضتوں کی وجہ سے کچھ علوم وارد ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔تو نبوت بھی اپنی ماہیت میں ایک انسانی عمل بن جائے گا۔

اہلِ سُنّت کے ہاں نبی کی نبوت میں کسب کا کچھ عمل دخل نہیں‘ لیکن علم الکلام کے نئے دعویداروں نے نبی کی بھی نئی تعریف بنائی‘ یہاں تک کہ توحید کی نئی تعریف بنائی۔ایسی ایسی تعریفیں اس وقت دنیا میں پائی جاتی ہیں جن کے نتیجے میں ایک ملحد کے موحد ہونے کا بھی امکان موجود ہے۔ بہت سے لوگوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی طریقے سے ان قطعیات پر حملہ آور ہوا جائے۔اور ان پر حملہ آور ہونے کے لیے جو علوم رکاوٹ بنتے ہیں‘ ان میں دو علوم بنیادی ہیں‘ ایک علم اصولِ دین ہے اور ایک علم اصول الفقہ ہے۔تو جو اجتہادِ مطلق کے دعویدار ہیں وہ ان دونوں علوم کی تجدید چاہتے ہیں۔لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ جو ماڈرنسٹ ہیں وہ نئے اصولِ فقہ چاہتے ہیں‘ جیسے مثال کے طور پر غامدی صاحب کا اگر آپ مطالعہ فرمائیں‘ ان کی سُنّت کی تعریف تو دیکھیں آپ کو پتا چلے گا کہ وہ نئے اصولِ فقہ کے دعویدار ہیں۔اصولِ فقہ کا مطلب ہے کہ جن اُصولوں کو بنیاد بنا کر دین کو سمجھا گیا اور استنباطِ مسائل ہوئے وہ کچھ ٹھیک نہیں تھے‘ تو اب آپ کو ہم نئے اصول دے رہے ہیں۔سُنّت کی تعریف پرانے لوگوں نے یہ سمجھی تھی‘ اصل میں تو یہ تھی۔لہٰذا انہوں نے کہا کہ سُنّت دین کا ماخذ ہے تو ماخذ تو ہم بھی مانتے ہیں لیکن سُنّت انہوں نے خبر واحد کو سمجھ لیا‘ اس کو دین کا ماخذ بنالیا تو ہمارے ہاں سُنّت خبر واحد نہیں کچھ اور ہوتی ہے۔دین کا ماخذ تو ہے لیکن خبر واحد نہیں ہے۔اسی طریقے سے جو لوگ عقائد کی سطح پر واردا تیں کرنا چاہتے ہیں وہ علم الکلام کو نشانہ بناتے ہیں‘ کیونکہ یہ علم الکلام ابھی بھی اللہ کے فضل سے (اور اللہ نے ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا کیے ہوتے ہیں کہ جو دین کی حفاظت کرتے ہیں) دین کی حفاظت کی راہ میں سب سے بڑی ڈھال اور دین پر حملہ آور ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

پھر آپ دیکھیں کہ بہت سے لوگ جو علم الکلام کا انکار کر رہے ہوں گے‘ جیسے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غزالیؒ نے مسلمانوں کو backward کر دیا‘ انہوں نے عقل پر پابندیاں لگا دیں۔جیسے ہود بھائی یا اس طرح کے لوگ ہیں‘

اگر ان سے پوچھا جائے کہ آپ ویسے دین کو مانتے ہیں کہ جو آپ کو ٹینشن پڑی ہوئی ہے کہ مسلمان پیچھے رہ گئے؟ آپ کہیں نا کہ میں خدا پر کامل یقین اور اعتماد رکھتا ہوں‘ ہاں امام غزالی نے کچھ گڑبڑیں کی ہیں جس کے نتیجے میں مسلمان کچھ پیچھے رہ گئے۔ پوچھا جائے کہ آپ امام غزالی پر تنقید کریں گے تو کسی جگہ پر کھڑے ہو کر کریں گے؟ اصل مسئلہ کیا ہے؟ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ دنیا میں ترقی اصل مقصود تھا وہ مغرب نے کر کے دکھادی ہے اور ہمارے ہاں امام غزالی ایسے لوگ تھے جنہوں نے ترقی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے عقل سے کہیں نہیں روکا تھا‘ وہ ایک الگ موضوع ہے‘ بلکہ ان پر تو اصلاً اعتراض ہی یہ ہے کہ انہوں نے منطق اور فلسفہ کو دین کے اندر گھسا دیا اور یہ اعتراض ہمارے روایت پسند کرتے چلے آئے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ ضرور بتایا ہے کہ دنیا سنوارنے سے زیادہ آخرت سنوارو۔ لہٰذا وہ جو احیاء العلوم کے نتیجے میں ایک پورا ڈسکورس پیدا ہوتا ہے اس کے نتیجے میں یقیناً دنیا میں وہ ترقی نہیں ہو سکتی جو مغرب نے کر کے دکھادی ہے۔ لہٰذا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے آخرت کو مقصود بنانا ہے یا دنیا کو مقصود بنانا ہے۔ لہٰذا امام غزالی نے اس اعتبار سے واقعی ایک پابندی لگادی تھی اور وہ ہماری پوری روایت میں لگائی گئی ہے‘ جس کے نتیجے میں یقیناً ایک انسان کی توجّہ آخرت کی طرف زیادہ ہوگی‘ دنیا کی طرف بھی ہوگی اور وہ اسے سنوارے گا لیکن حدود کے اندر رہ کر‘ کچھ اخلاقیات کے اندر رہ کر‘ کچھ قوانین شریعت کے اندر رہ کر۔ اصل مسئلہ یہ بنتا ہے۔ اس وقت مزاج یہ ہے کہ قطعیات وغیرہ کوئی شے نہیں ہوتی‘ اصل علم وہ ہے جو دنیا میں کچھ کر کے دکھا دے‘ کچھ اس دنیا میں ترقی کر کے دکھا دے‘ کچھ اس سے پروڈکشن ہو۔ اللہ تک بے شک نہ پہنچائے‘ لیکن چاند پر ضرور پہنچا دے۔ تو یہ آج کی دنیا کا مزاج ہے۔ وہاں بیٹھ کر جب آپ بتاتے ہیں کہ فلاں فلاں شے قطعی ہے تو وہ ان کے لیے بالکل ہضم ہونے والی بات ہی نہیں ہوتی۔ کیا قطعی تم نے لگایا ہوا ہے؟ حق ایک ہوتا ہے اور یہ دین برحق ہے‘ اور قیامت وغیرہ یہ سب غیبی معاملات ہیں‘ ان کا حسیات سے کیا تعلق ہے؟ اصل چیز تو حس ہے جو نتیجہ پیدا کر کے دکھا دے سامنے۔ تو یہ ایک مزاج ہے جس کے نتیجے میں کچھ اقوال برآمد ہو رہے ہوتے ہیں۔ تو اس مزاج کو ایڈریس کرنے کی بجائے کئی دفعہ ہم امام غزالی کی نصوص نکال کے دکھائیں گے کہ امام غزالی نے تو عقل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے‘ امام غزالی بھی یہی چاہ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہ رہے تھے جو آپ چاہ رہے ہیں۔ یعنی جو آپ چاہ رہے ہیں وہ واقعی امام غزالی نہیں چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام غزالی کسی اور دنیا کے راہی ہیں اور آپ کسی اور دنیا کے راہی ہیں۔ وہ کچھ اور چاہتے تھے‘ آپ کچھ اور چاہتے ہیں۔ تو یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔ بہرحال علم الکلام کے بارے آپ کو کچھ سمجھ آ رہا ہوگا کہ اس کے اندر کیا کیا مباحث ہیں۔ مباحث تین ہیں: بیانِ عقائد‘ اثباتِ عقائد‘ اور دفعِ شبہات۔ یہ تین مباحث ہیں جن پر علم الکلام گفتگو کرتا ہے۔

پھر ہمارے علماء نے کہا‘ فلسفہ بھی یہی کہتا ہے کہ انسان کے کچھ بنیادی سوالات ہوتے ہیں‘ تو اصلاً فلسفہ بھی اسی کو ایڈریس کر رہا ہوتا ہے اور دین بھی اسی کو ایڈریس کرتا ہے اور کچھ حتمی جوابات دیتا ہے۔ بعض علماء کلام نے ان

سوالات کو تین میں جمع کیا ہے جو فلسفہ میں بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: مِنْ اَیْن' اِلٰی این' فِی این؟ یہ تین بنیادی سوالات ہیں اور تینوں میں ''اَین'' ہی ہے۔ ''مِنْ این'' کا سوال ہے مبدا کا' اِلٰی این کا سوال ہے معاد کا' اور فی این کا سوال ہے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟ یعنی مبدا' معاد اور موجود دنیا اور اس کے احوال۔ فی این کا مطلب ہے: اس وقت کیا کرنا ہے؟ کیا اخلاقی قانون ہے؟ جینا کیسے ہے اور کیا اعمال اختیار کروں گا جس کے نتیجے میں مَیں اپنے کمال اور اپنی سعادت کو پہنچوں گا؟ ان تین بنیادی سوالات کا حتمی جواب دینے کا دعویدار دین ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ مَیں حتمی طور پر بتا دوں گا' یعنی اس کو ہم علم عقیدہ کہتے ہیں' وہ دین سے جدا کوئی شے نہیں ہے' وہ دین کے دیے ہوئے حقائق کا علمی بیان ہے۔ وہ آپ کو حتمی جوابات دیتا ہے کہ بھئی تم یہاں سے آئے ہو' یہاں جا رہے ہو اور تم نے یہ کرنا ہے۔ اب آپ دیکھیں آج کا پھر علمی مزاج یہ ہے کہ سوالوں کو ایڈریس کرو' جوابات کو چھوڑو۔ اور یہ عجیب بات ہے۔ اتفاق سے مَیں کل برٹرینڈ رسل کی کتاب Problems of Philosophy کی عبارت دیکھ رہا تھا تو مجھے قرآن مجید کی وہ آیت یاد آ گئی کہ ﴿بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝۹﴾ (الدخان) یعنی وہ کہہ کیا رہا ہے:

> *Philosophy is to be studied not for the sake of any definite answers to its question since no definite answers can, as a rule,be known to be true, but Rather for the sake of question themselves.*

اور اس کا فائدہ' اس کے ہاں یہ ہے کہ آپ کے فکری مدارک وسیع ہوتے چلے جائیں گے' آپ میں وسعت نظری پیدا ہوگی وغیرہ۔ پھر سوال پوچھا کہ پھر کیا ہوگا؟ یعنی آپ نے وسعت نظری پیدا کر لی اور سارا کچھ کر لیا اور مدارکِ فکر یہ آپ کے بہت زبردست ہو گئے' لیکن حتمی اور قطعی (definite) جواب پھر بھی آپ کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ یعنی آپ کو ایک زندگی ملی ہے اور وہ ان کے ہاں ایک چانس کے نتیجے میں مل گئی ہے' اس میں آپ ظہور پذیر ہو گئے ہیں اور اس میں بھی آپ حتمی جواب نہیں جان سکتے۔ اور اسی طرح رخصت ہو کر دنیا سے چلے جائیں گے اور اس پر بہت نازاں اور خوش بھی ہیں۔ اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کہہ رہے ہیں کہ

﴿بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝۹﴾ (الدخان) اور

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۝۱۲﴾ (الطور)

اصل میں تو یہ ہے کہ شک آپ کے اندر ایسا اضطراب پیدا کرے کہ جس کے نتیجے میں آپ سفر طے کرتے ہوئے یقین تک پہنچیں۔ مگر شک میں لعب کیا ہے کہ شک میں ہیں اور شک ہی کو انجوائے کرنا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ فلاسفی کا مطالعہ کرو' سوالات کے جوابات کے لیے نہیں' کیونکہ وہ کبھی بھی پتا نہیں چلنے' تو پھر کیا کریں؟ for the sake of questions themselves۔ سوال بڑے زبردست ہیں اور جواب کوئی نہیں! تو پوری زندگی گزار دو۔ ایک زندگی ملی ہے اور عجیب بات ہے کہ انسان آئے اور اس کو ان بنیادی سوالات کے جواب نہ مل سکیں۔ ایک ہے کہ وہ کوشش میں لگا رہے اور نہ مل سکے اور ایک یہ ہے کہ وہ پہلے دن سے کہہ دے کہ مل بھی نہیں سکتا' پھر بھی ساری زندگی گزار دے۔ دین اور عقیدہ یا قرآن ایسے شخص کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یعنی جس شخص کے دل میں واقعی ان

سوالات کے صحیح جوابات جاننے کی خواہش ہوگی اور پھر اس کے پاس وحی کی ہدایت آجائے تو اس کے لیے اس سے بڑی کیا نعمت ہے! اسی لیے کئی دفعہ ہم وحی یا قرآن کو appreciate اس لیے نہیں کر رہے ہوتے کہ ہم بھی دنیا میں اتنے مگن اور مشغول ہیں کہ یہ بنیادی سوالات ہمارے لیے مسئلہ نہیں بن رہے ہوتے، لیکن جس شخص کے لیے واقعی مسئلہ بن رہے ہوں تو اسے وحی کی نعمت کا اندازہ ہوگا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ①﴾ کی تفسیر مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ نے یوں کی کہ گویا یہ ایسے شخص کے دل سے نکلنے والی آواز ہے کہ جو افکار کی دنیا میں سرگرداں تھا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہیں اُسے حق نہ ملا اور پھر اُسے ایسی کتاب مل گئی جس میں عوج (ٹیڑھ) نہیں تھا اور جو قیم تھی۔ سب سے بڑھ کر اللہ کی تعریف اس بات پر ہے کہ اللہ نے ایسی کتاب اتار دی ہے جس میں ہدایت کا ایسا بیان ہے جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، عوج نہیں ہے، جو بالکل سیدھی راہ دکھاتی ہے۔ یہ بنیادی سوالات آپ کو تنگ کریں گے۔ اور تنگ کرنا چاہیے ہر انسان کو اور پھر آپ کو حتمی جواب ملے جس سے طمانیت اور سکون حاصل ہو جائے اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہی حق ہے تو اس سے بڑی نعمت کیا ہوگی۔ یہ چاہتے کیا ہیں؟ جیسے میں نے برٹرینڈ رسل کی عبارت سے واضح کیا کہ ان کے ہاں حق کوئی شے ہوتی ہی نہیں۔ لہٰذا متاثرینِ فلسفہ مغرب کہیں گے کہ علم الکلام کو بدل دینا چاہیے۔ یعنی قطعیات بھی کچھ ظنیات ہو جائیں۔ کچھ چیزیں تم نے خواہ مخواہ مان لی ہیں اور دین کے اصولوں میں شمار کر لی ہیں، وہ اصول نہیں ہیں، ان میں بھی کچھ نرمی دکھاؤ۔ یہ نیا علم الکلام ہے جس میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں قرار پاتا، کیونکہ یہ مباحث کس علم سے تعلق رکھتے ہیں؟ علم الکلام سے تعلق رکھتے ہیں کہ رسول پر ایمان لانا ہے کہ نہیں لانا۔ عقیدہ کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔ تو نیا علم الکلام کیا کہہ رہا ہے جس کے بہت سے لوگ دعویدار ہیں کہ رسول پر ایمان لانا بھی ضروری نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جدید علم الکلام کے کچھ دعویدار یہ بھی بتا رہے ہیں کہ توحید جس طرح تم لوگ سمجھتے ہو کہ توحید ہوتی ہے وہ بھی ضروری نہیں ہے۔ یعنی ایک ملحد نہ جانتے ہوئے بھی ایک موحد سے بڑھ کر موحد ہو سکتا ہے، لہٰذا آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے باقاعدہ جمعہ کے خطبات میں اسٹیفن ہاکنگ کے لیے مغفرت کی دعائیں بھی کروائی ہیں، میری مراد ڈاکٹر عدنان ابراہیم فلسطینی ہیں۔ اب یہ موقف بھی جدید علم الکلام کی پیداوار ہے۔ ان کا اس موضوع پر پندرہ سو صفحات پر ایک thesis ہے، جہاد، قتال، جزیہ، عقیدہ، اور غیر مسلموں کا کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر عدنان ابراہیم عالم فاضل آدمی ہیں۔ پچھلے تیس سال سے آسٹریلیا میں ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے بہت سی چیزیں سیکھی ہیں۔ منطق اور اصولِ فقہ پر ان کے بہت زبردست لیکچرز ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں بھی افکار میں ایک تدریج ہے اور تدریجاً انہوں نے یہ موقف اختیار کیے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوگا کہ آپ کو بتایا جائے گا سٹیفن ہاکنگ ''رحمہ اللہ'' اللہ کے ایک بڑے ولی تھے۔ نئے علم الکلام کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد یہ نتیجہ ہو سکتا ہے، یہ بعید از قیاس باتیں نہیں ہیں، بلکہ لوگ اس طرف جا رہے ہیں۔ یعنی اگر منبر پر کھڑے ہو کر اس کے لیے استغفار شروع ہو گیا تو اس کے بعد اگلا کوئی

بیس تیس سال بعد اس کو ولی اللہ بھی قرار دے دے گا۔ اور اس میں توحید کی ایک ایسی تعریف آجائے گی جس کے نتیجے میں آج تک کے تمام موحدین مشرکین قرار پائیں گے اور سٹیفن ہاکنگ اللہ کے ولی قرار پائیں گے۔

بس یہ نعرہ لگا دینا کہ جدید علم الکلام کی ضرورت ہے' بھائی! تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟ تم نے کیا علم الکلام میں پڑھا ہے اور پھر کیا تم دین میں سمجھتے ہو؟ کچھ عقائد طے شدہ ہیں یا نہیں؟ کیونکہ علم الکلام کا ایک بڑا حصّہ بیانِ عقائد پر مشتمل ہے' تو تمہیں بیانِ عقائد سے بھی کچھ مسائل ہیں کہ عقیدہ کا بیان بھی نہیں ہونا چاہیے کیا؟ پھر تمہارا خیال ہے کہ عقیدے پر دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی قسم کی دلیل قائم نہیں ہوسکتی تو مختلف مذاہب میں کیسے امتیاز کرو گے؟ حق و باطل میں تفریق کے کیا اصول ہوں گے؟ سبھی یہی کہیں گے کہ ہمارا عقیدہ ماورائے دلیل ہے تو ہمارے عقیدے پر دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔ ہماری بھی نہیں ہوسکتی' تمہاری بھی نہیں ہوسکتی۔ تو حق و باطل میں تمیز کے تمام دروازے بند ہوتے چلے جائیں گے۔ تو یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے جتنا اس کو ہنسی مذاق میں اڑا دیا جاتا ہے۔ تو پہلے جو شخص ہے اس کو دیکھو وہ کیا کہہ رہا ہے' پھر اس سے پوچھو تمہیں کچھ آتا جاتا بھی ہے' تم کچھ پڑھ بھی سکتے ہو؟ چلو تم امام رازیؒ کی تفسیر کبیر کھول کر اس کے چار صفحے پڑھ کر دکھا دو' پھر ہم تم سے پوچھ لیتے ہیں کہ علم الکلام کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا؟ پھر تم نیا علم الکلام بنا لینا۔ تو آج کل نئے علم الکلام کو بنانے کے لیے قدیم کو جاننا ضروری نہیں ہے' اسلامک سائنسز یا علوم اسلامیہ سے کوئی واقفیت ضروری نہیں ہے۔ یہاں تک کہ عربی زبان سے بھی' حالانکہ یہ تو علم آلہ ہے' اس کے اوپر کھڑے ہو کر تم نے اپنی عمارت تعمیر کرنی ہے' اس سے بھی کوئی واقفیت ضروری نہیں ہے۔ لیکن پھر دعویدار ہیں Islamic Renaissance کے کہ پوری دنیا میں ہم نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کر دینی ہے اور یہ ہو جائے گا اور وہ ہو جائے گا اور تمہیں اپنی خبر ہی نہیں۔ یعنی دین کی قطعیات اور دین کے اصول کی دھجیاں بکھیر دیں گے اور اپنے خیال میں احیائے اسلام کے مشن پر کھڑے ہوں گے۔

بہر حال یہ علم الکلام کی کچھ بنیادی باتیں ہیں۔ یعنی اگر آپ کو ویسے فلسفے کی زبان میں پوچھنا ہو کہ علم الکلام کیا ہے؟ تو آپ یوں بتائیں گے کہ بنیادی انسانی سوالات کے حتمی جوابات۔ اور وہ بنیادی سوالات تین ہیں: من این' الی این' فی این۔ مبدأ' معاد اور حاضر۔ ان تین سوالات کا ایسا حتمی حل جس سے اطمینانِ قلبی حاصل ہو جائے ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾۔ ذکر اللہ سے مراد یہاں سلف کی تفسیر میں قرآن بھی ہے۔ یعنی اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ ای اَلَا بِالْقُرْآنِ۔ اللہ کی یاد سے یعنی قرآن سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور یہ قرآن هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔

آج کل ایک نیا فلسفہ بھی آرہا ہے کہ دین تو برحق ہے لیکن باقی علم الکلام ہو' فقہ ہو' شریعت ہو' یہ سب تو human understanding ہے' انسانی تعبیر ہے اور انسانی تعبیر تو غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اگر ایک خاص پیراڈائم میں رہ کر دیکھا جائے تو بات ٹھیک بھی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ جو نکال رہے ہیں' وہ بہت خطرناک ہے کہ اصل میں دین کچھ بھی نہیں ہوتا' یہ تو سب انسانی تعبیرات ہوتی ہیں جو دین کا بیان ہوتا ہے۔ لہٰذا جب انسانی تعبیر ہوئی تو پھر تقدس اڑ گیا۔ تقدس ایسے اُڑ گیا کہ انسانی تعبیر ہے اور انسانی تعبیر کو کوئی دوسری تعبیر replace بھی کر سکتی ہے۔ پھر یہ بھی

آپ کو کون بتائے گا کہ کہاں انسانی تعبیر ہے اور کہاں انسانی تعبیر نہیں ہے۔ یعنی کیا چیز قطعی اور کیا ظنی ہے۔ ظنی کا مطلب ہے جہاں انسانی تعبیر کا عمل دخل ہے۔ اور قطعی کا مطلب یہ ہے کہ یہ شے حتمی ہے‘ اس میں انسانی تعبیر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور انسان کو ایسے ہی ماننا ہے۔ یہ آپ کو کون بتائے گا؟ یہ علم الکلام اور اصولِ فقہ بتائیں گے۔ تو علم الکلام کو اُڑا دینے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ کے پاس کوئی معیار نہیں ہے جس کی بنیاد پر آپ بتا سکیں کہ قطعیات کیا ہیں‘ ظنیات کیا ہیں‘ کہاں تبدیلی آسکتی ہے‘ کہاں زمان و مکان سے فتویٰ بدل جاتا ہے‘ کہاں زمان و مکان کا کوئی اثر اس مسئلے پر نہیں ہوگا۔ یہ سب کچھ آپ کو یہ علوم بتائیں گے۔ ان میں سرفہرست علم الکلام ہے۔ علم الکلام علم العقیدہ ہے‘ علم اصول دین ہے‘ علم التوحید ہے‘ علم الفقہ الاکبر ہے۔ تو یہ سب باتیں علم الکلام سے طے ہوں گی۔

ابھی تک ہم نے اس علم کی تین تعریفات دیکھی تھیں‘ ایک عضدالدین الایجیؒ کی‘ دوسری امام غزالیؒ کی اور پھر کمال الدین البیاضیؒ کی فقہ الاکبر میں سے‘ اور ہم نے اس علم کا موضوع طے کیا کہ یا تو وجود ہے اور پھر لوگ وجود کی تقسیمات کرتے ہیں: واجب الوجود‘ ممکن الوجود۔ یا علم کا موضوع اللہ کی ذات‘ صفات اور اس کے افعال ہیں اور اسی سے تمام علوم پھوٹتے چلے جاتے ہیں اور اس کا فائدہ‘ ثمرہ اور غایت کیا ہے کہ اس کے ذریعے عقائد کا بیان ہوتا ہے حُجت کے ساتھ اور شبہات کی نفی ہوتی ہے۔ یہ بنیادی طور پر ہم نے بات کی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ جو علم الکلام کے منکرین ہیں ان کے کچھ مسائل ہیں اور ان مسائل کی بنیاد کیا ہے۔

اب آخری بات یہ ہے کہ فی زمانہ کچھ تو ایسے ہیں جو ماڈرنسٹ ہیں یا سیکولر ہیں اور وہ دین کو نہیں مانتے ہیں اور وہی جدید علم الکلام کے دعویدار بھی ہیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو بظاہر بالکل روایت پسند ہیں اور قرآن‘ حدیث سب کو ماننے والے ہیں‘ وہ بھی علم الکلام کو نہیں مانتے‘ وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک بدعتی علم ہے‘ مذموم علم ہے‘ ائمہ نے اس کی مذمت بیان کی ہے‘ لہٰذا یہ علم بالکل فضول ہے‘ اس کو اٹھا کے پھینک دینا چاہیے۔ اس میں عجیب و غریب مباحث ہیں‘ اللہ کے نبی ﷺ سے تو کبھی ہم نے جوہر‘ عرض اور اس طرح کی باتیں نہیں سنیں۔ لہٰذا جو اللہ کے نبی نے باتیں نہیں کیں اور جہاں اللہ کے نبی ﷺ اور صحابہ رک گئے وہاں ہمیں رک جانا چاہیے اور اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ دیکھو جو ائمہ دین ہیں امام شافعی‘ امام ابوحنیفہ اور خصوصاً امام شافعی رحمہم اللہ ان سے کتنے اقوال مروی ہیں علم الکلام کی مذمت میں۔ یعنی مثال کے طور پر امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ’’حکمی فی اھل الکلام ان یضربوا بالجرید والنعال‘‘ کہ اہلِ کلام کے بارے میں میرا حکم یہ ہے یعنی میرا فتویٰ یہ ہے کہ جوتوں سے اور کھجور کی ٹہنیوں سے ان کو مارا جائے یعنی ان کی چھترول ہونی چاہیے۔ پھر انہوں نے کہا‘ یہ بھی امام شافعیؒ سے مروی ہے کہ اگر انسان شرک کے سوا تمام گناہ قیامت کے دن اللہ کی خدمت میں لے کر حاضر ہو تو یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ کلام لے کر آجائے۔ یعنی کلام گویا شرک تک تو نہیں پہنچتا‘ لیکن شرک سے نیچے جتنے بھی گناہ ہیں ان میں سب سے بڑا گناہ علم الکلام ہے۔ تو اس طرح کی عبارات نکالتے ہیں۔ پھر ہمارے بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے باقاعدہ ذمّ الکلام کے نام سے کتابیں لکھیں‘ جیسے ابواسماعیل الہروی‘ ایک صوفی تھے حنابلہ میں سے‘

جن کی ''منازل السائرین'' ایک کتاب ہے جس کی علامہ ابن قیمؒ نے شرح کی ہے ''مدارج السالکین'' کے نام سے۔ بہرحال ابواسماعیل الہرویؒ کا ایک پورا رسالہ ہے: ''ذمّ الکلام'' اور یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مطلقاً علم الکلام کی مذمّت کی۔ یعنی کوئی تقسیم نہیں کی علم الکلام کی کہ محمود بھی ہوسکتا ہے' مذموم بھی ہوسکتا ہے' بس جہاں کلام آ گیا وہاں کلام نہ کرو' وہاں چپ ہوجاؤ اور اس کی مذمت بیان کرو۔ تو یہ جو ایک طرزِ عمل پیدا ہوا اس کے ماننے والے اور دعویدار ان کے ہاں علوم میں گہرائی نہیں ہوتی اور سطحیت بہت زیادہ ہے' یعنی سیدھی بات ہے کہ مذمت کسی خاص شے پر وارد ہوتی ہے' لفظ کلام تو ایسی شے نہیں ہے کہ جس کو مذموم قرار دیا جاسکے' کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ لامشاحۃ فی الاصطلاح' اصطلاحات میں علماء لڑتے نہیں ہیں۔ اصل میں دیکھا جائے گا کہ علم الکلام سے آپ مراد کیا لے رہے ہیں' یعنی اس کا معنی اگر درست ہے تو تسلیم کرلو' نہیں درست تو تسلیم نہ کرو۔ لہٰذا صرف یہ کہنا کہ علم الکلام مطلقاً مذموم ہے تو یہ ایک جاہلانہ اور بچگانہ روش ہے۔

علماء نے کہا ہم اس کو تو مانتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے اس طریقے پر گفتگو نہیں کی اور علم الکلام کا اس طرح بیان نہیں کیا' لیکن کیا جو باقی علوم ہیں وہاں اللہ کے نبی ﷺ نے اسی طرح بیان کیا تھا کہ اصولِ فقہ میں خاص کی دلالت قطعی ہوتی ہے' عام کی دلالت بھی قطعی ہوتی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ اصولِ فقہ کے تمام مباحث کیا اللہ کے نبی ﷺ سے اس طرح مروی ہیں؟ نہیں مروی۔ تو اب مدوّن ہوکر آ گئے ہیں ناں کچھ ضروریات کے تحت۔ کچھ داخلی اور خارجی عوامل کی وجہ سے ایک علم علم اصول الفقہ کے نام سے وجود میں آ گیا۔ اسی طریقے پر کہا گیا کہ جیسے علم اصول حدیث ہے تو کیا یہ تقسیم صحابہؓ کے ہاں ملے گی کہ ایک روایت منقطع ہے' ایک معضل ہے' ایک معلق ہے؟ کتنی تقسیمات ہیں' کتنے نئے الفاظ ہیں۔ تو اگر صرف نئے الفاظ سے تمہیں چڑ ہے تو نئے الفاظ تو ہر علم نے پیدا کر کے دکھائے ہیں۔ وہ تو علم اصول الفقہ میں بھی ہیں' علم اصول الحدیث میں بھی ہیں' فقہ میں بھی ہیں' یعنی اس طریقے پر اصطلاحات تمہیں صحابہ کے ہاں ملیں گی کہ ایک مکروہ تحریمی ہوتا ہے' ایک تنزیہی ہوتا ہے' حدیث سے ثابت ہو تو واجب ہوتا ہے' قرآن سے ثابت ہو تو وہ فرض ہوتا ہے؟ تو کہاں ملیں گے؟ یا تو پھر سارے علوم کا انکار کردو' تو پھر تم اپنے موقف میں consistent ہوجاؤ گے کہ ٹھیک ہے ہم کسی علم کو نہیں مانتے۔ نہ ہم اصولِ فقہ کو مانتے ہیں' نہ اصولِ حدیث کو مانتے ہیں' نہ تصوّف کو مانتے ہیں' نہ علم الکلام کو مانتے ہیں' تو پھر ہم کہیں گے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یعنی اپنے باطل موقف میں consistent ہوجاؤ گے۔ لیکن اگر تم صرف علم الکلام کے پیچھے پڑ جاؤ اور باقی علوم کو تسلیم کرو تو یہ بات درست نہیں ہے۔ تو جس طرح نئی اصطلاحات نئے عوامل کی وجہ سے ہر علم میں پیدا ہوئیں اسی طرح یہاں بھی پیدا ہوئی ہیں' کچھ مسائل ایسے پیدا ہوگئے' کچھ تراجم ہوگئے' کچھ باطل فرقے پیدا ہوگئے' ان سے جھگڑنے کی ضرورت پیش آئی' لہٰذا علماء نے ایک علم مدوّن کیا اور اس کے کچھ اصول وضوابط بنالیے۔ طے کرنا ضروری تھا کہ یہ فرقہ دین سے خارج ہے یا نہیں۔ معتزلہ خارج ہیں یا نہیں' کیسے طے کریں گے؟ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ قطعی کیا ہوتا ہے اور ظنی کیا ہوتا ہے۔ یعنی آپ خود ہی سوچ لیں کہ آپ نے کسی کی تکفیر کردی تو تکفیر کرنے کے لیے آپ کو پتا چلانا

پڑے گا کہ دین میں وہ شے کیا ہے جس کے بغیر دین میں دخول نہیں ہوتا ہے اور وہ شے کیا ہے جو ہے تو بالکل درست لیکن اگر کوئی نہ بھی مانے تو فاسق و فاجر بدعتی ہو جائے گا لیکن کافر نہیں ہوگا۔ کیسے تقسیم ہوگی؟ تو تقسیم کرنے کے لیے کچھ بنیادی اصول چاہئیں۔ اگر اصول بنا لیے جائیں تو آپ کہتے ہیں کہ اصول غلط ہیں۔ تو ایک اجمالی جواب اس طریقے پر دیا گیا۔ پھر اس کا تفصیلی جواب آپ کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں' بتایا گیا کہ فقہ کے نئے مسائل کیسے پیدا ہوئے' اصولِ فقہ کے نئے مسائل کیسے پیدا ہوئے' حدیث کی تدوین اور اصولِ حدیث کی ضرورت کیوں پیش آئی' ان میں جرح و تعدیل کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور نئے مسائل آ رہے تھے اور استنباط کے لیے اصول چاہئیں تھے' جن کی تدوین ضروری تھی۔ اسی طرح یہاں بھی آپ کو بتا دیں گے کہ کیا باطل فرقے وجود میں آئے؟ کیا کلام وجود میں آیا؟ کیا مسائل یونانی ترجمہ کی وجہ سے پیدا ہوئے؟ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا جواب علماء نے یہ دیا کہ یہ جو مسائل مروی ہیں امام شافعی علیہ الرحمہ سے' امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے بھی کچھ اس طرح کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں' لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اپنی اوّلین زندگی میں متکلّم تھے۔ یعنی ان کی علمی ابتدا علم الکلام سے اور متکلم کی حیثیت سے ہوئی' ان کے مناظرے بھی مشہور ہیں مختلف فرقوں کے ساتھ۔ پھر ان کی توجّہ فقہ کی طرف ہوگئی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ الاکبر بھی تو عقیدہ کا ایک متن ہے جو انہی سے مروی ہے اور ابھی تک اس کی شرح ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی شرح کی۔ امام ابومنصور ماتریدی اور ملا علی قاری علیہما الرحمہ کی شرح بہت مشہور ہے' اور بھی علماء شرح کرتے چلے آئے ہیں۔ تو فقہ الاکبر کا متن کلام کا متن ہے۔ امام جعفر الطحاویؒ کا جو متن ہے' وہ بھی عقیدہ کا متن ہے' اسی کو کلام کا متن کہتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ جس زمانے میں امام شافعیؒ' امام احمد بن حنبلؒ اور یہ لوگ کلام کی مذمت کر رہے تھے تو اُس وقت کلام کے جو ائمہ تھے وہ اصلاً باطل فرقوں کے امام تھے۔ کیا مطلب؟ معتزلہ بھی متکلمین ہیں۔ یعنی جب ہمارے علماء کہتے ہیں تو معتزلہ کو بھی متکلّمین میں شمار کرتے ہیں' لیکن وہ متکلّمین تھے کچھ باطل خیالات و افکار اور باطل اصول پھیلا رہے تھے' تو امام شافعیؒ جب ''الکلام'' کہہ کر مذمّت کر رہے ہیں تو الکلام میں جو الف لام ہے وہ عہد ذہنی کا ہے۔

لغت کے اعتبار سے' خارج میں کچھ لوگ مراد ہیں' تو خارج میں مراد ابوالحسن الاشعری نہیں ہیں کہ ان کا وجود نہیں ہوا' خارج میں مراد ابومنصور ماتریدی نہیں ہیں' خارج میں مراد متکلمین جو اہلِ سُنّت کے ہیں وہ ہو نہیں سکتے۔ کون ہیں؟ اس وقت غلبہ جن لوگوں کا ہو رہا ہے اور جو ان مسائل میں گفتگو کر رہے ہیں' وہ معتزلہ ہیں' وہ جہمیہ ہیں' وہ قدریہ ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا یہ جو ساری مذمت ہے ان لوگوں پر ہے۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جو علم الکلام یا ان مباحث کے نتیجے میں ایسے نتائج پیدا کر رہے ہیں جو قرآن و حدیث کے مخالف ہیں' جو قرآن و حدیث کی طے شدہ باتوں کے مخالف ہیں' تو ایسا علم الکلام تو مذموم ہی ہے۔

باقی یہ کہنا کہ الکلام مذموم ہے اور امام شافعیؒ نے یہ فرمایا ہے تو انہوں نے تو فرمایا ہے مگر ابوالحسن الاشعریؒ اور ابومنصور ماتریدیؒ اور یہ سارے متکلمین تو بعد میں آئے ہیں' تو کیسے ان کی مذمت کا اطلاق ان لوگوں پر ہوگا؟ لیکن وہ

مذمت کیے چلے جا رہے ہیں کہ امام شافعیؒ نے علم الکلام کی مذمت کی ہے‘ لہٰذا علم الکلام پر جو امام رازیؒ کی کتاب ہے وہ مذموم ہے۔ کیوں؟ امام شافعیؒ نے کہا ہے! امام شافعیؒ کہاں اور امام رازیؒ کہاں؟ تو امام رازیؒ خود شافعی ہیں اور امام شافعی کے تمام اقوال کو جانتے ہیں۔ لہٰذا یہ بچگانہ سی باتیں ہوتی ہیں کہ ائمہ نے ان کی مذمت کر دی ہے لہٰذا اس سے دور رہنا چاہیے۔ اصل میں مذمت کی ہے بدعتی اور باطل افکار و خیالات کی‘ وہ جہاں بھی ہوں گے اس کی مذمت کی جائے گی۔ اور اللہ کے فضل سے اس وقت بھی یا پرانے زمانے میں بھی جس علم نے ان بدعتی خیالات کا رد کیا وہ بھی علم الکلام ہے۔ کس نے رد کیا معتزلہ پر؟ کس نے ردّ کیا باطل فرقوں پر؟ ظاہر ہے متکلمین نے کیا ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ جو علم الکلام پر تنقیدیں وغیرہ ہوتی رہتی ہیں‘ ٹھیک ہے کرتے رہے کچھ لوگ بیچارے‘ ان کا مزاج نہیں ہے۔ یعنی کچھ لوگوں کا مزاج نہیں ہوتا‘ کچھ لوگوں کو اللہ نے بنایا اس طرح ہوتا ہے کہ انہوں نے خاص حرفیت پر چلنا ہوتا ہے تو وہ ٹھیک ہے‘ لیکن انسان کو اپنا مزاج سمجھ لینا چاہیے اور اپنے مزاج کو سمجھ کر وہ خود بھی بے شک اسی جگہ کھڑا رہے۔ لیکن دوسروں کے مزاجوں کو اور مزاجوں میں پائے جانے والے تنوع کو اور اختلاف کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ مختصراً آج کا بیان تھا۔ علم الکلام یا علم عقیدہ کی تعریف اور اس کی وضاحت اور اس کی domain کیا ہے اور مجالِ بحث کیا ہے۔ بہرحال ان تین سوالات پر آپ بھی غور کیجیے کہ من أین‘ فی أین اور اِلٰی أین۔ میرے ذہن میں کئی دفعہ آتا ہے کہ ہر انسان کو بہت غور کرنا چاہیے کہ وہ وجود میں آ گیا ہے تو وہ کیسے زندگی گزار رہا ہے؟ کیا واقعی اس نے اپنے مقصد کو پہچانا ہے یا والدین سے سن لیا ہے کہ میرا مقصد عبادت ہے؟ کبھی اُس نے اپنے وجود کو محسوس کیا کہ مَیں واقعی موجود ہوں؟ ایک بڑے بزرگ کا قول یہ سنا تھا: ’’بہت سے لوگ مر جاتے ہیں اور انہیں نہیں معلوم ہوتا کہ وہ وجود رکھتے ہیں‘‘۔ یعنی انہوں نے کبھی اپنے وجود کو experience ہی نہیں کیا کہ ان کو پتا چل جائے کہ میں واقعی ایک موجود وجود ہوں۔ آئے‘ گزر گئے‘ روزمرہ کی اشیاء اور مصروفیات میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے‘ اس طریقے پر زندگی گزر جاتی ہے اور وجود کی نعمت کا احساس نہیں ہوتا۔ اور پھر وجود کی نعمت کا احساس ہو جائے تو پھر واقعی کرنا کیا ہے‘ کس مقصد کے لیے انسان دنیا میں آیا؟ اس کو پہچانے اور بلاوجہ وقت ضائع نہ کرے۔ یہ ساری چیزیں اصلاً علم عقیدہ بتا رہا ہے۔ تو علم عقیدہ کو اس نگاہ سے پڑھیے۔ یعنی اپنا حال ایسا بنائیں کہ جس کے نتیجے میں قرآن کا عقائد والا بیان آپ کے لیے آنکھیں کھول دینے والا ہو اور آپ کے لیے اطمینانِ قلب کا باعث ہو۔ اگر ہمارا وہ حال نہ ہو تو قرآن اس طرح اثر نہیں کر رہا ہوتا‘ کیونکہ قرآن کے اثر کے لیے جو مجھ میں حال چاہیے وہ پیاس کا حال ہے۔ یعنی جس طرح پانی کو آپ کیا زبردست طریقے پر محسوس کر لیتے ہیں جب آپ شدید پیاسے ہوتے ہیں‘ پانی افطاری کے وقت جب پیتے ہیں تو سکون آ جاتا ہے‘ اسی طریقے پر ایک حق کی پیاس ہو اور پھر جب قرآن آپ کے سامنے پڑھا جائے‘ قرآن کی تلاوت ہو تو آپ کو اس کیفیت سے بہت بڑھ کر کیفیت حاصل ہو گی کہ جو شدید پیاس میں ٹھنڈا پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ تو یہ کیفیت جب پیدا ہو گی تو بات واضح ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ!

(جاری ہے)

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : پھسلتے پتھر Slippery Stone by: Khalid Baig

کلیدی موضوعات : موسیقی، اسلام، تصوف، سماع، گانے

مترجم : عارف الحق عارف

قیمت: 20 امریکی ڈالر

ملنے کا پتہ: A-93، اٹاوہ سوسائٹی، احسن آباد، کراچی 75340

کتاب کے مصنف خالد بیگ پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں مگر انہیں قرآن وسنّت کی تعلیمات کے ساتھ والہانہ لگاؤ ہے۔ انہوں نے اسلامی مشاہیر کے لٹریچر کا خاصا مطالعہ کر رکھا ہے۔ وہ لندن سے شائع ہونے والے ایک معروف جریدے میں کالم لکھتے رہے ہیں۔ مصنف نے انگریزی، عربی اور اردو میں موسیقی کے موضوع پر لکھی گئی بیشتر کتابوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور انہی کی روشنی میں یہ گراں قدر کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلامی لٹریچر میں کبھی موسیقی کو اچھا نہیں سمجھا گیا، کیونکہ یہ جذبات کو غیر معتدل کر دیتی ہے، البتہ قرآن مجید کو خوش الحانی یعنی تجوید سے پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ اس سے پڑھنے اور سننے والوں میں سنجیدگی اور احترام پیدا ہوتا ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ معروف اسلامی سکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے تحریر کیا ہے اور مقدمہ سیّد سلیمان ندویؒ کے صاحبزادے سید سلمان ندوی نے لکھا ہے، جنہوں نے مصنف کے کام کو سراہا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں اور ہر حصّہ چند ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں چار، دوسرے حصے میں چھ اور تیسرے حصے میں دو باب ہیں۔ ہر باب اپنے عنوان کی توضیح میں انتہائی جامع ہے۔ اس کے علاوہ دو ضمیمے ہیں جن میں اہم مباحث کا خلاصہ بیان کر کے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ سماع حرام اور قبیح ہے جو لہو ولعب کے سوا کچھ نہیں۔ موسیقی اور آلاتِ موسیقی کی حرمت کے بارے میں اسلامی قانون کے تمام مسالک میں اتفاقِ رائے ہے۔

چند ابواب کے عنوانات اس طرح ہیں: اسلام اور شاعری، موسیقی اسلام سے پہلے اور بعد میں، ماہرین علوم شرقیہ کی آراء، اسلامی ماخذات قرآن اور حدیث کے متن، سماع کے بارے میں اہل تصوف کا نقطہ نظر، فقہاء کے فتاویٰ اور ملاہی (لہو ولعب) کی بحث۔

یہ کتاب انگریزی میں لکھے گئے اسلامی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور تحقیق میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک راہنما کتاب ہے۔ کتاب عمدہ کاغذ پر شائع کی گئی ہے اس کی مضبوط جلد خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ مزین ہے۔

(۲)

نام کتابچہ : قرآن کا چیلنج (ساری دنیا کے لیے)

مصنف : ایم۔ وائی عالم

ملنے کا پتہ : مکان نمبر 683، گلی نمبر 92، سیکٹر G-9/4 اسلام آباد

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے قرآن مجید کی صورت میں ضابطہ حیات محفوظ کر دیا۔ اب قیامت تک کے لیے یہی قرآن سارے انسانوں کے لیے راہنما ہے، جو ہر قسم کی غلطیوں سے پاک ہے۔ یہ خود انسان کے خالق کا اتارا ہوا ہے۔ یہ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا جنہوں نے اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔

اس کتابچے میں قرآن مجید کے دس چیلنج چند آیات کی روشنی میں درج کیے گئے ہیں جن میں خدائی تعلیم واضح کر دی گئی ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی سے لے کر معاشرے کی پُرامن تشکیل کے لیے یہ راہنما اصول ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب ان الٰہی ہدایات سے منہ موڑا گیا تو فساد برپا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے اس قرآن کی تعلیم پر مبنی معاشرہ تشکیل کیا تو ہر طرف امن اور چین قائم ہو گیا اور دنیا جنّت نظیر بن گئی۔

بیان کیے گئے چیلنجز میں پہلا چیلنج (۱) توحید ہے کہ اس کائنات کا خالق بس ایک ہی ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ جب اور جہاں توحید خداوندی کے بجائے کئی خداؤں کو مانا گیا تو فساد برپا ہوا۔ (۲) انسانوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ ہدایت کی طرف بلاؤ، کسی طرح کی زبردستی کی اجازت نہیں۔ (۳) بات ناپ تول کر سچی کی جائے، مشکوک بات کو چھوڑ دیا جائے۔ (۴) انصاف قائم کیا جائے اور گواہی سچی دی جائے۔ (۵) تمام انسان ایک مرد اور عورت سے پیدا کیے گئے، کسی قوم یا قبیلے کے افراد کو دوسروں پر بڑائی حاصل نہیں۔ اگر بڑائی ہے تو نیکی اور پارسائی کے ساتھ ہے۔ (۶) انسانوں کو آپس میں مل جل کر زندگی گزارنی ہے۔ قرآن کا دیا ہوا طریقہ آسان اور سہل ہے۔ (۷) دوسرے انسانوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے۔ (۸) معیشت انصاف پر مبنی ہو۔ ناجائز منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور سود کی ممانعت ہے۔ مال کی تقسیم کا وہ انداز اختیار کیا جائے جو مبنی بر انصاف ہو اور کسی کو اس کے مال سے محروم نہ کیا جائے۔ (۹) اسلام نے حکمرانی کے اصول متعین کیے ہیں۔ حکمران بھی قانون کا پابند ہوگا اور اگر غلط کرے گا تو سزا پائے گا۔ وہ ملک میں امن قائم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ (۱۰) اسلامی سیاست کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر انسان کی جان محترم ہے۔ سزا صرف مجرموں کے لیے ہے۔

یہ ہیں قرآن کے متعین کردہ وہ اصول جن پر عمل پیرا ہو کر عدل و انصاف پر مبنی صالح معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-An'am

(The Cattle)

(Recap of verses 130 – 144 of Surah Al-An'am and fresh exposition of verses 145 – 165 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap ofverses 130 – 144 (inclusive) of Surah 6, Al-An'am

This section of Surah 6, Al-An'am (verses 130 - 144) starts by elucidating that on the Day of Resurrection Allah *(SWT)* will ask the disbelieving Jinns and humans as to why they disbelieved in His *(SWT)* verses sent to them through the Messengers *(AS)* from among them, who *(AS)* recited to them His *(SWT)* revelations and warned them of the Day of Reckoning? In reply, they will have nothing to answer. The verse then clarifies that the real reason for their disbelief was the charms and fleeting enjoyments of this worldly life, which made them follow the wrong path, and that eventually made them heedless to their tormenting end. They were deniers of and disbelievers in, rather than ignorant of, the truth. They would acknowledge that the truth had been conveyed to them but they refused to accept that. It is then declared that Allah's *(SWT)* punishment does not descend on any town or city in this world for their disbelief and disobedience until and unless He *(SWT)* warns them through His *(SWT)* Messengers *(AS)*. Furthermore, it is expounded that with Allah *(SWT)*, there are ranks or degrees for classes of people amongst the humans and the Jinns and these ranks or degrees are assigned according to their deeds and good actions that they perform in this world. It is then explained that Allah *(SWT)* does not send Messengers *(AS)* to the Jinns and the mankind because He *(SWT)* 'needs' our worship or obedience. Instead, He *(SWT)* is free of all wants and is not in 'need' of His *(SWT)* servants to obey Him *(SWT)* or worship Him *(SWT)*; rather it is we who stand in need of Him *(SWT)* in all situations, and He *(SWT)* is full of mercy for His *(SWT)* creation.

This section of Surah 6, Al-An'am (verses 130 - 144) continues by stating emphatically that the Day of Resurrection / Day of Judgement is surely to come and on that day the disbelievers will not be able to escape from Allah's *(SWT)* punishment. On the Day of Resurrection, human beings of every epoch will be raised anew and made to stand before Allah *(SWT)* for final judgement. Furthermore, Allah *(SWT)* commands the Holy Prophet *(SAAW)* to give the pagans of Makkah a stern warning and tell them that stay as you are and keep on doing what you are doing against Islam and the Muslims, for I *(SAAW)* will

remain on the Path of Allah *(SWT)* and will keep on doing what Allah *(SWT)* reveals unto me *(SAAW)* to do and soon you will find out who will be blessed with salvation in the Hereafter and who will suffer the punishment. Allah *(SWT)* also declares that everything is created by Him *(SWT)* alone and the produce of the lands, too, is bestowed by Him *(SWT)* alone, yet the disbelievers had transgressed by making false idols to share in what was given by Him *(SWT)* alone. The belief of the pagans in Allah *(SWT)* was so flimsy that whenever they had a drop in their produce they would apply this shortfall against the share that they had 'assigned' for Allah *(SWT)* and kept 'giving' their idols in full. If something from the portion reserved for the idols went into the portion they had 'reserved' for Allah *(SWT)* 'by mistake' they would take it out! On the other hand, if something from the portion they had 'fixed' for Allah *(SWT)* 'accidentally' mixed with the portion of their idols, they would not take it out, for they would say that the 'idol is poor'. It is declared that this action of the pagans of Makkah is a blatant transgression based on evil, for they do not realize that everything belongs to Allah *(SWT)* alone. It must be noted that this is an elucidation of just one of the many acts of 'ignorance' which those people insistently clung to, and which they were not prepared to forsake. They are also told about that major 'wrong' which, if not abandoned, will bar their way to salvation.

This section of Surah 6, Al-An'am (verses 130 – 144) also refers to one of the evil customs of the pagans (of Makkah) during the Age of Ignorance (Jahiliyyah), i.e. killing their female children (infanticide). Allah *(SWT)* condemns such brutal acts of the pagans by declaring that Satan made it seem fair for them to kill their children, for fear of poverty and burying their daughters alive, for fear of dishonor. The devils (of mankind and jinns) had convinced the idolaters that the killing of their children was desirable; in order to destroy whatever of their morality was left.

Furthermore, this section of Surah 6, Al-An'am (verses 130 – 144) also alludes to another of the ritualized and erroneous customs of the pagan Arabs. The pagan Arabs would release some animals as well as endow some tillage in the name of the idols and say that they were doing it for the pleasure of Allah *(SWT)* and only those were allowed

to eat of them whom they chose themselves. They also dedicated some animals to their idols, with the prohibition of riding them or to carry loads. Allah *(SWT)* not only judges such practices to be polytheistic, but also censures them as man-made innovations. Allah *(SWT)* declares that all these so-called customs and rituals are all lies and fabrications and He *(SWT)* will surely punish such a people in the Hereafter for what they used to invent against Him *(SWT)*.

Allah *(SWT)* declares that such a people have indeed gone astray and are not guided on the Right Path. The pagan Arabs had also introduced many other innovations themselves, making them part of their religion and ascribing them to Allah *(SWT)*. How could such people be considered either to have attained salvation or to be rightly guided? Even though venerated by them as their ancestors, they were nevertheless misguided and were destined to see the evil consequences of their misdeeds.

Allah *(SWT)* also expounds the wonders and blessings that He *(SWT)* has bestowed upon His *(SWT)* creatures in the form of the produce that grows in the earth and different kinds of fruit which He *(SWT)* brings forth from it. He *(SWT)* also allows the production of various kinds of vegetation, plants, trees and gardens on the land as a means of survival for His *(SWT)* creatures. It is decreed that that humans ought not to commit excess or waste in any manner, for Allah *(SWT)* does not like those who are spendthrifts.

Allah *(SWT)* ordains in this section of Surah 6, Al-An'am (verses 130 – 144) that humans are allowed to eat from the things that He *(SWT)* has made lawful for His *(SWT)* servants and tells them not to follow the footsteps of the devils who ignore the divine law revealed by Allah *(SWT)* and take their innovated customs and their desires as their religion. The truth is that Satan only wants Allah's *(SWT)* servants to become the dwellers of the Hellfire, thus he invites them to falsehood and misguidance. The disbelievers are challenged by Allah *(SWT)* to come forward with arguments based on sound, reliable knowledge, rather than with arguments which have no authority except that of ancestral tradition, conjecture or superstition.

The section of Surah 6, Al-An'am (verses 130 - 144) ends by referring once again to the devious superstitions and fabricated customs of the Pagan Arabs. They took the things as lawful which Allah *(SWT)* had made unlawful for them and they made unlawful which He *(SWT)* had permitted for them. Allah *(SWT)* mentions various kinds of cattle, male and female, such as sheep, camels, cows and goats and declares that He *(SWT)* did not prohibit any of these cattle or their offspring, rather they were all created as a means of survival and other benefits for His *(SWT)* servants but these unjust people concocted lies against Him *(SWT)*, thus leading others astray from the straight path. It is /categorically decreed that Allah *(SWT)* does not guide the people who are wrongdoers, meaning those who invent lies against Allah *(SWT)* and His *(SWT)* Messenger *(SAAW)*.

==========

Expositionof verses145 – 165 of Surah Al-An'am

Verse 145

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"Say, "I do not find within that which was revealed to me [anything] forbidden to one who would eat it unless it be a dead animal or blood spilled out or the flesh of swine– for indeed, it is impure – or it be [that slaughtered in] disobedience, dedicated to other than Allah. But whoever is forced [by necessity], neither desiring [it] nor transgressing [its limit], then indeed, your Lord is Forgiving and Merciful."

This verse declares that whatever Allah *(SWT)* has allowed in His *(SWT)* Divine Revelation to His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* is lawful and whatever He *(SWT)* prohibited is unlawful. However, regarding everything else which He *(SWT)* has not mentioned, there is no sin in consuming it. Then Allah *(SWT)* mentions some of the things which He *(SWT)* has made unlawful for His *(SWT)* servants, which have already been commented upon in verse 173 of Al-Baqarah. The slight difference between this verse and verse 173 of Surah al-Baqarah is that whereas the verse in Surah al-Baqarah mentions 'blood' as

prohibited, this verse qualifies it with 'outpoured', i.e., the blood which has flowed as a result of either injuring or slaughtering an animal. It constitutes an elucidation of the former injunction rather than the revelation of a different one. This is not an independent, divergent injunction; it is a somewhat further explanation of the category signified in Islamic jurisprudence as 'carrion'.

The verse mentions that 'temperamental dislike,' however, is quite a different matter. The Law of Allah *(SWT)* does not force anyone to eat everything which is not prohibited (which is lawful). Simultaneously, the Law does not entitle anybody to exalt his likes and dislikes into a criterion of what is lawful and unlawful. No one is justified in criticizing others for consuming lawful things which offend his tastes.

The final part of the verse elucidates the exception to the rule mentioned above. In the case of a 'life and death' situation, even the unlawful is allowed to be consumed, but only to the extent that it is sufficient to save a life and with extreme dislike. In that case, Allah *(SWT)* may not consider it a transgression and forgive with His *(SWT)* infinite mercy.

Verse 146

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۝

"And to those who are Jews We prohibited every animal of the un-cloven hoof; and of the cattle and the sheep We prohibited to them their fat, except what adheres to their backs or the entrails or what is joined with bone. [By] that We repaid them for their injustice. And indeed, We are truthful."

This verse mentions some of the food that Allah *(SWT)* had prohibited for the Jews because of their transgressions. It states that Allah *(SWT)* prohibited the meat of those animals with un-cloven (undivided) hoofs like the camels and duck, and the fat of cattle and sheep, except for that part which is attached to their backs or their intestines or is mixed with their bones.

The punchline of this verse is that whatever was forbidden for the Jews was due to their transgressions and served as a punishment for them.

Verse 147

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

"So if they deny you, [O Muhammad], say, "Your Lord is the possessor of vast mercy; but His punishment cannot be repelled from the people who are criminals."

This verse commands the Holy Prophet *(SAAW)* that if the disbelievers and your *(SAAW)* enemies deny you *(SAAW)*, then tell them that your Lord *(SWT)* is Infinite in His *(SWT)* Mercy, thus encouraging them to repent and follow the Holy Prophet *(SAAW)*, but at the same time, warn them that if they do not give up denying you *(SAAW)*, then they ought to know that His *(SWT)* scourge and wrath will never be averted from them.

In short, if they could still give up their disobedience and return to the true service of Allah *(SWT)*, they would find Him *(SWT)* ready to embrace them with His *(SWT)* mercy. But if they persisted, they should remember that no one could save them from His *(SWT)* wrath.

Verse 148

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝

"Those who associated with Allah will say, "If Allah had willed, we would not have associated [anything] and neither would our fathers, nor would we have prohibited anything." Likewise did those before deny until they tasted Our punishment. Say, "Do you have any knowledge that you can produce for us? You follow not except assumption, and you are not but falsifying."

The idolaters of Makkah claimed that because the Qur'an professes that Allah *(SWT)* has full knowledge of their polytheism that they are committing, similar to what their ancestors had done, and Allah *(SWT)* also has full knowledge of the things that they have forbidden which He *(SWT)* made lawful for them, therefore, in their twisted argument, they said that that if they were on the wrong path, surely

Allah *(SWT)* would have directed them to faith, but as He *(SWT)* did not, thus it indicates that they are on the right path.

Allah *(SWT)* retorts in this verse by decreeing that similar were the claims and excuses of those who denied His *(SWT)* revelations and committed polytheism from amongst the previous nations, and thus were destroyed by Him *(SWT)* for their transgressions and He *(SWT)* made them taste tormenting punishment.

Allah *(SWT)* declares that such people only follow conjectures and falsehood, but in reality they do not have any knowledge or proof for their false claims.

Verse 149

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

"Say, "With Allah is the far-reaching [i.e., conclusive] argument. If He had willed, He would have guided you all."

This verse further elaborates on the response to the false arguments made by disbelievers mentioned in the previous verse. It alludes to the fact that Allah *(SWT)* does what He *(SWT)* wills; therefore, if He *(SWT)* would have willed He *(SWT)* could have guided all of them to faith, but He *(SWT)*, in His *(SWT)* perfect Wisdom, has given man the freedom of choice and action as a trial in this world and has helped him to find the right path by sending His *(SWT)* Messengers *(AS)* and His *(SWT)* revelations.

This provides a complete refutation of the excuse made by the disbelievers mentioned in the previous verse. We need to do a careful analysis, in this case. In the first place, they are told that citing Allah's *(SWT)* will to justify one's errors and misdeeds and make it a pretext for refusing to accept the right guidance was the practice of the evil-doers before them. But they should remember that this had led to their ruin, and they were witnesses to the evil consequences of deviation from the truth. Furthermore, it is being clarified that the unbelievers' plea that the only reason for their error was that Allah *(SWT)* had not willed that they be guided to the truth, is based on fancy and conjecture rather than on sound knowledge. They refer to Allah's *(SWT)* will without understanding the

relationship between Allah's *(SWT)* will and man's action.

Allah *(SWT)* gave the freedom of action and option to man under His *(SWT)* own overall universal plan. The aim of this plan has been elucidated in Ayah 2 of Surah Mulk as follows:

"Who has created death and life that He may test you which of you is best in deed."

Allah *(SWT)* provided proper guidance to man through His *(SWT)* prophets *(AS)*. After having received the guidance it is up to the man to choose a path. He cannot defend his own limited right to choose a wrong path. He cannot present this frivolous excuse that Allah *(SWT)* has not willed that he be guided to the truth.

The reason of creation of death and life in above verse closes any door to let the man think that "it was not Allah's *(SWT)* intent to create him with 'inherent right guidance 'like angels, that is why he persisted in error." Everyone will be held responsible for choosing false ways, for having a false intent, and for having striven for false ends. The truth is that the unbelievers were not prepared to take the Straight Path, of their own choice and volition. As it was not Allah's *(SWT)* intent to create them with 'inherent right guidance' like the angels, they would be allowed to persist in the error they had chosen for themselves.

Verse 150

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝

"Say, [O Muhammad], "Bring forward your witnesses who will testify that Allah has prohibited this." And if they testify, do not testify with them. And do not follow the desires of those who deny Our verses and those who do not believe in the Hereafter, while they equate [others] with their Lord".

In this verse, Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* to tell the idolaters to bring forth their witnesses who can testify that Allah *(SWT)* indeed forbid that they have forbidden themselves. The verse immediately and emphatically commands the Messenger

(SAAW) not to believe in their witnesses' testimony, even if they testify, as it is false and untrue. Allah *(SWT)* further instructs His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* to inform his *(SAAW)* companions not to follow the false desires of the idolaters, who make a mockery of Allah's *(SWT)* revelations, disbelieve in the Hereafter and associate others with Allah *(SWT)* in worship.

A person who is conscious that he should testify only to that which he knows, can never testify that the taboos regarding food and other customs prevalent in their society had been enjoined by Allah *(SWT)*. But if some people are brave enough to feel no compunction in bearing false witness, then at least the believers should not become their partners in lying. The real purpose of this verse in asking them to testify honestly whether their customs and practices had been sanctioned by Allah *(SWT)* is to stimulate those with some sense of honesty to reflect on the character of their customs and practices. Perhaps when they realize that there is no evidence of those prohibitions having been prescribed by Allah *(SWT)*, some of them may decide to get rid of them.

==========

Verse 151

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

"Say, "Come, I will recite what your Lord has prohibited to you. [He commands] that youdo not associate anything with Him, and to parents, good treatment, and do not kill your children out of poverty; We will provide for you and them. And do not approach immoralities – what is apparent of them and what is concealed. And do not kill the soul which Allah has forbidden [to be killed] except by [legal] right. This has He instructed you that you may use reason."

In this verse, Allah *(SWT)* instructs His Messenger *(SAAW)* to tell the idolaters to come along so that he *(SAAW)* may recite to them things which Allah *(SWT)* has made unlawful for them.

It must be noted before proceeding further that the self-imposed restrictions which had shackled their lives were not those imposed by Allah *(SWT)*. The really worthwhile restrictions are those prescribed by Allah *(SWT)* in order to regulate human life. These have always served as the essential basis of all God-given codes.

The first principle or commandment mentioned in this verse is that they should associate none with Allah *(SWT)* in His *(SWT)* divinity: neither in His *(SWT)* essence, nor in His *(SWT)* attributes, nor in His *(SWT)* powers and authority, nor in the rights He *(SWT)* has against His *(SWT)* creatures.

To associate someone with Allah *(SWT)* in His *(SWT)* divinity is to declare that the former shares the essence of Allah's *(SWT)* divinity. Instances of associating others in Allah's *(SWT)* essence are the Christian doctrine of the Trinity, the belief of the pagan Arabs that angels are daughters of Allah *(SWT)*, and the belief of other polytheists in the divine character of their self-styled gods and goddesses and, in some cases, of their royalty. Likewise, a person associates others in the attributes of Allah *(SWT)* when he considers someone other than Allah *(SWT)* to be invested with those attributes which belong exclusively to Allah *(SWT)*. One becomes guilty of this kind of polytheism if one believes somebody either to know all the mysteries of the Unseen or to be all-seeing and all-hearing or to be free of all defects and weaknesses and thus infallible. Again, a person associates others in the authority of Allah *(SWT)* when he recognizes someone to be possessed of authority which belongs to Allah *(SWT)* alone by virtue of His *(SWT)* godhead; for example, the power to either benefit or harm people in a supernatural manner, to fulfil the needs of people and rescue them from distress, to protect and shield them, to hear their prayers, to make or mar their fate. Such authority belongs to Allah *(SWT)* alone, and recognizing anyone other than Allah *(SWT)* as possessing it is tantamount to associating others with Allah *(SWT)* in His *(SWT)* authority.

If someone accords any of these rights to anyone other than Allah *(SWT)*, he is guilty of associating others with Allah *(SWT)* in His *(SWT)* Divinity. His guilt is the same whether or not he calls such beings divine.

The second principle or commandment mentioned is that one must ensure fair treatment of one's parents, which includes showing them respect and reverence, obeying them, keeping them pleased, and serving them. The Qur'an always mentions this right of the parents immediately after mentioning the duty one owes to Allah *(SWT)* alone. lt makes it quite clear that the rights of parents have precedence over those of other human beings.

The third principle or commandment mentioned in this verse is that Allah *(SWT)* made it unlawful to kill one's children from fear of poverty because He *(SWT)* is responsible for feeding and providing provision for their children and not them.

The fourth principle or commandment mentioned in this verse is to avoid 'fawahish'. The word fawahish applies to all those acts whose abominable character is self-evident. In the Qur'an all extra-marital sexual relationships, sodomy, nudity, and false accusations of un-chastity are precisely reckoned as 'shameful deeds' (fawahish). In Hadith, theft, taking intoxicating drinks, and begging have been characterized as fawahish, as have many other brazenly indecent acts. Man is required to abstain from these acts openly and in secret.

The fifth principle or commandment mentioned in this verse is that it is unlawful to take the life of another human being unless there is a clear exception (just cause) mentioned in the Qur'an and the Ahadith. It means that human life, which has been declared inviolable by Allah *(SWT)*, can only be destroyed for a just cause. As for what is meant by 'just cause', we ought to remember that three cases are embodied in the Qur'an whereas two additional cases have been stated by the Prophet *(SAAW)*. The cases mentioned in the Qur'an are as follows:

(1) That a man is convicted of deliberate homicide, and thus the claim of retaliation is established against him.

(2) That someone resists establishing the true faith so that fighting against him might become necessary.

(3) That someone is guilty of spreading disorder in the Domain of Islam and strives to overthrow the Islamic order of government.

The two cases mentioned in the Hadith are:

(1) That a person commits illegitimate sexual intercourse even after marriage.

(2) That a Muslim is guilty of apostasy and rebellion against the Muslim body-politic.

Except for these five reasons, slaying a human being is not permissible, regardless of whether he is a believer, a protected non-Muslim (dhimmi) or an ordinary unbeliever.

Verse 152

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

"And do not approach the orphan's property except in a way that is best [i.e., intending improvement] until he reaches maturity. And give full measure and weight injustice. We do not charge any soul except [with that within] its capacity. And when you speak [i.e., testify], be just, even if [it concerns] a near relative. And fulfill the covenant of Allah. This has He instructed you that you may remember."

This verse picks up from where the previous verse finished and commenced by mentioning the sixth principle or commandment that Allah *(SWT)* commands those guardians who have taken orphans into their care that they should not be unjust to them by using their wealth or eating from it unlawfully.

Instead, they should protect the orphan's property and invest it in the best possible way to improve it, and when the orphan reaches the age of maturity, his property should be entrusted to him. In a nutshell, one's handling of orphans' property should be based on maximum selflessness, sincerity, and well-wishing for the orphans; it should be of a kind that lends itself to no reproach, either from Allah *(SWT)* or man.

The seventh principle or commandment mentioned is to be just while giving and taking. It means that the giver should not decrease anything from what is due to be received by the other person, and the receiver should not take anything more than what he has to receive from the giver. Then Allah *(SWT)* states that whoever strives to establish justice in his rights and the rights of others but commits an honest mistake after trying his best, then there is no sin on him. Even though this is a full-fledged postulate of the law of Allah *(SWT)*, it is mentioned here to stress that one who tries to remain fair and just to the utmost of his ability, in giving weight and measure and in his dealings with people, will be acquitted of responsibility for the error. If any mistake in weight or measure occurs out of oversight, and thus involuntarily, he will not be punished.

The eighth principle or commandment mentioned is that there should be justice in action and statement, which implies that whether it is a witness statement given, a testimony, a judgment, or a ruling, one should always abide by the truth and justice even if it is against one's relatives and friends.

The verse ends with the decree by Allah *(SWT)* commanding His *(SWT)* servants to fulfill all their covenants and treaties made with Him *(SWT)*, which means that they ought to refrain from what He *(SWT)* has prohibited and taken what He *(SWT)* has permitted, and have faith in His *(SWT)* Prophets *(AS)* and follow them *(AS)*, and He *(SWT)* also commands His *(SWT)* servants to fulfill those covenants and treaties made with their fellow beings. Thus these are the commandments that He *(SWT)* has emphasized for humans to observe the divine guidance and follow His *(SWT)* path.

'Covenant of 'Allah' signifies, in the first place, the commitment to Allah *(SWT)*, as well as to human beings, to which man binds himself in His *(SWT)* name. It also signifies that covenant between man and Allah *(SWT)* and between one human being and another, which automatically takes place when a person is born onto Allah's *(SWT)* earth and into human society. The first two covenants mentioned are voluntary and deliberate, whereas the last one is natural. The last one is no less binding than the first two, even though man does not make

it of his own volition. For when a man enjoys his existence, makes use of his physical and mental energy, benefits from the means of sustenance and natural resources - in other words, when he benefits from the world created by Allah *(SWT)* and avails himself of the opportunities provided for him by the operation of natural laws - he incurs certain obligations towards Allah *(SWT)*.

In the same way, when one derives nourishment and sustenance from the blood of one's mother while in her womb, when one opens one's eyes in a family which is supported by the toil of one's father, when one benefits from the various institutions of human society, one is placed in varying degrees of obligation towards those individuals and institutions. This covenant between man and Allah *(SWT)* and between man and society is inscribed, not on a piece of paper, but every fiber of man's being. Man has not entered into this covenant consciously and deliberately, yet the whole of his being owes itself to it. Verse 27 of Surah al-Baqarah alludes to this covenant when it says that those are the transgressors 'who break the covenant of Allah *(SWT)* after its firm binding and cut asunder what Allah *(SWT)* has commanded to be joined and spread mischief on earth'. It is also mentioned in verse 172 of Surah al-A'raf in the following words: 'And recall when your Lord took the children of Adam from their loins and made them testify as to themselves saying, "Am I not your Lord?" (to which) they answered, "Yes, we do bear witness to it. "

Verse 153

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

"And, [moreover], this is My path, which is straight, so follow it; and do not follow [other] ways, for you will be separated from His way. This has He instructed you that you may become righteous.

This verse, too, picks up from the previous two verses, declaring that the principles or commandments mentioned in those two verses lead to the 'Straight Path' prescribed by Allah *(SWT)*. Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* servants that this is the only straight path – Islam, which is heading towards the required destination, thus follow it and adher to it. Allah *(SWT)* forbids them to cause divisions

and disputes within their religion, thus ordaining that they ought not to follow different ways on their own. Whoever takes his way shall go far away from His *(SWT)* path.

Moreover, it is also declared that when man follows the "Straight Path" of Allah *(SWT)* sincerely, only then can he attain righteousness.

It is an essential corollary of the natural covenant mentioned above that man should follow the way prescribed by his Lord *(SWT)*; any deflection from the orders of Allah *(SWT)*, or serving anyone other than Him *(SWT)*, constitutes a primary breach of that covenant. Once this breach has been committed every single article of the covenant is likely to be violated one after the other. Moreover, it should also be remembered that man cannot acquit himself of the highly delicate, extensive and complex set of responsibilities entailed by this covenant unless he accepts Allah's guidance *(SWT)* and tries to follow the way prescribed by Him *(SWT)*.

Non-acceptance of Allah's *(SWT)* guidance necessarily produces two grave and damaging consequences. First, by following any other way, one is inevitably led away from the true path and is thus deprived of the opportunity to approach Allah *(SWT)* and please Him *(SWT)*. Second, as soon as man deviates from the Straight Way prescribed by Allah *(SWT)*, he encounters a whole labyrinth of highways and byways, causing the entire human species to fall a prey to total bewilderment and perplexity, and which shatters all dreams of a steady advance towards maturity and betterment.

Verse 154

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝

"Then We gave Moses the Scripture, making complete [Our favor] upon the one who did good [i.e., Moses] and as a detailed explanation of all things and as guidance and mercy that perhaps in the meetingwith their Lord they would believe."

In this verse, Allah *(SWT)* states that He *(SWT)* revealed His *(SWT)* Book, The Torah, to His *(SWT)* Prophet Moses *(AS)* as guidance for the Children of Israel and thus to complete His *(SWT)* favour on those who

would do good to others. He made the Torah a complete and comprehensive Book, explaining all details needed to complete and follow His *(SWT)* law. Further, Allah *(SWT)* said that He *(SWT)* made this Book as guidance and mercy for them so that they come to believe in the Hereafter and thus do righteous deeds.

To believe in 'meeting with the 'Lord' signifies the conviction that one is answerable to Allah *(SWT)*, leading one to adopt responsible behaviour in life.

The statement made here could mean two things. It might mean that the heavenly Book vouchsafed teachings to Prophet Moses *(AS)* could in itself create a sense of responsibility among the Israelites. Alternatively, it might mean that when ordinary people observe the excellent way of life prescribed by Allah *(SWT)*, and note the beneficial effects of its merciful dispensation in the lives of righteous people, they will come to realize that belief in the After-life is, in all respects, a better basis for human life than its denial. In this way, their observation and study might turn them from rejection of the true faith.

==========

Verse 155

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۙ

"And this [Qur'an] is a Book We have revealed [which is] blessed, so follow it and fear Allah that you may receive mercy.

This verse declares that after giving Torah to Prophet Moses *(AS)*, Allah *(SWT)* revealed this Final and Most Complete revelation, the Glorious Qur'an to the Seal of the Prophets Muhammad *(SAAW)*.

Allah *(SWT)* commands the believers to obey Him *(SWT)* as per the Holy Qur'an's dictates. He *(SWT)* directs them to preach this message of the Qur'an to others. As a result, Allah *(SWT)* will bestow mercy on those who follow His *(SWT)* commands individually and collectively. He gives a glad tiding of saving those from Hellfire's torments, which will practically follow and implement the commands in their lives.

Verse 156

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۙ

"[We revealed it] lest you say, "The Scripture was only sent down to two groups before us, but we were of their study unaware,"

The allusion made in this verse is to the Jews and Christians, while those being directly addressed are the Pagan Arabs to whom Allah *(SWT)* sent His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* from among them and revealed the Glorious Qur'an to him *(SAAW)* in their language so that these idolaters have no excuse that no Book was given to them as were given to the Jews and the Christians, namely the Torah and the Gospel. Thus they would be unable to claim that they were unaware of the message as they did not receive or understand it.

Verse 157

أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّا أَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِأٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ
بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝

"Or lest you say, "If only the Scripture had been revealed to us, we would have been better guided than they." So there has [now] come to you a clear evidence from your Lord and a guidance and mercy. Then who is more unjust than one who denies the verses of Allah and turns away from them? We will recompense those who turn away from Our verses with the worst of punishment for their having turned away."

The Pagan Arabs are being directly addressed in this verse and told that they would not be able to use the excuse, on the Day of Judgement, for not following the Islamic Monotheism and say that if they would have been given the Book, then they would undoubtedly have followed it better than Jews and the Christians. The verse elucidates that the reason is that Allah *(SWT)* showed them His *(SWT)* signs and sent them His *(SWT)* Final Messenger *(SAAW)*, bringing clear guidance and mercy for all humanity.

This clear guidance is further supported by the Ayahs of Surah Al-Baiyyinah as follows:

1. Those who disbelieve from among the people of Scripture (Jews and Christians) and Al-Mushrikun, were not going to leave (their

disbelief) until there came to them clear evidence.

2. A Messenger, Muhammad *(SAAW)* from Allah *(SWT)* reciting (the Qur'an) purified pages.

3. Wherein are correct and straight laws from Allah *(SWT)*.

After that, those who reject Islam and do not follow the Prophet Muhammad *(SAAW)* instead turn their backs on the revelation brought by the Holy Prophet *(SAAW)* and hinder others from following, are told emphatically that they are unjust, meaning that they are unbelievers. It is then told that such people who turn away from Allah's revelations *(SWT)* will face a dreadful punishment for their aversion from the truth on the Day of Judgement.

'Signs of Allah' mentioned in this verse include the teachings embodied in the Qur'an and the Sahih Ahadith. They are also manifest in the noble life of the Holy Prophet *(SAAW)* and the pure lives of those who believed in him *(SAAW)*. They also include the natural phenomena to which the Qur'an refers in support of its message.

Verse 158

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ
لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

"Do they [then] wait for anything except that the angels should come to them or your Lord should come or that there come some of the signs of your lord? The Day that some of the signs of your Lord will come no soul will benefit from its faith as long as it had not believed before or had earned through its faith some good. Say, "Wait. Indeed, we [also] are waiting."

The verse starts with a stern warning for the disbelievers who deny Allah's *(SWT)* Messengers *(AS)* and make a mockery of His *(SWT)* revelations. Allah *(SWT)* has already shown them His *(SWT)* signs, and they already knew about the Prophecies and the previous Divine Books. They also listened to the Holy Quran's recitation, but they still did not believe and rejected faith. Therefore, Allah *(SWT)* states in this verse that what else are they waiting for before they would embrace

Islam? Are these disbelievers waiting for the angels to come down to them, or they are waiting for the Day of Judgment when Allah *(SWT)* will descend and will decide their fate, or are they waiting to see the last of the signs from their Lord *(SWT)* for the coming of the Hour?

Allah *(SWT)* portends the disbelievers that as soon as the signs of the Hour appear, it will not be possible for them to accept faith, and all doors of repentance will be closed for them. It is narrated by Abu Hurayrah *(RA)* that the Prophet *(SAAW)* once said: "The Last Hour will not commence until the sun rises from the West. When the people witness that, they will all believe. This is when no good will it do to a person to believe then if he believed not before."

Therefore, whenever the 'signs' of the approach of the Day of Reckoning or Allah's *(SWT)* scourge or any other sign that will uncover the truth appears, after that, there will be no reason left for testing man. Those tokens will be so clear that after their appearance, it will neither avail the unbeliever to repent of his unbelief nor the disobedient to forsake his disobedience. For faith and obedience have meaning and value only as long as the truth remains hidden, as long as the tenure of life granted to people does not seem to have approached its end. The world with all its vanities continues to delude the disbelievers that, as there may 'neither be Allah *(SWT)* nor After-life', one should eat, drink and enjoy oneself as best one can.

In short, this verse is a warning for the disbelievers that if they still do not believe, then wait for the Day of Reckoning, and we shall wait too to see what Allah *(SWT)* decides for you.

Verses159

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾

"Indeed, those who have divided their religion and become sects you, [O Muhammad], are not [associated] with them in anything. Their affair is only [left] to Allah; then He will inform them about what they used to do".

The verse decrees that those who do not follow the Straight Path of their Lord *(SWT)* and divide their religion into sects, following their desires and misguidance, have fallen into the ways of error and innovations. Then Allah *(SWT)* addresses the Holy Prophet *(SAAW)* that he *(SAAW)* has nothing to do with these disbelievers and innovators, for their case is in Allah's *(SWT)* hands. He *(SWT)* will punish them on the Day of Judgment for all evil they used to commit.

It must be noted that the commandment in this message is directed to the Holy Prophet *(SAAW)* and through him *(SAAW)* to all followers of the true faith. The import of this statement is that true faith has always consisted, and still consists, in recognizing the One True Allah *(SWT)* as one's only God *(SWT)* and Lord *(SWT)*; in associating none with Him *(SWT)* in His *(SWT)* divinity – neither in respect of His *(SWT)* essence, nor of His *(SWT)* attributes, nor His *(SWT)* claims upon His *(SWT)* creatures; in believing in the Hereafter and hence considering oneself answerable before Allah *(SWT)*; and in living according to those principles and values which have been communicated by Allah *(SWT)* to humanity through His *(SWT)* Prophets *(AS)* and Books. This was the religion entrusted to the man at the beginning of human life. All false religions which emerged later stemmed from the perverted ingenuity of man, from his baser lusts, and from an exaggerated sense of devotion to venerable personalities. Such factors corrupted the original religion and overlaid it with harmful innovations. Hence, people modified and distorted the original beliefs by mixing them with products of their conjecture and philosophical thinking. More and more innovations were added to the original laws of the true religion. Putting aside the Law of Allah *(SWT)*, men set themselves up as their own law-makers, indulged in hair-splitting elaborations, and exaggerated the importance of disagreements in minor legal problems. Thus there emerged innumerable religions and sects, the birth of each leading to the fragmentation of humanity into an ever-increasing number of mutually hostile groups. Anyone who decides to follow the True Religion must therefore cut himself off from all deviant factions and revert to the True Religion.

Verses 160

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

"Whoever comes [on the Day of Judgement] with a good deed will have ten times the like thereof [to his credit], and whoever comes with an evil deed will not be recompensed except the like thereof; and they will not be wronged."

This verse elucidates the modus operandi of reward and punishment in the Hereafter from the Most Exalted *(SWT)* and Most Merciful *(SWT)*. A person (provided that he is a Muslim) who does one good deed will get ten times more in return and a person who commits one sin, then the return for him will be equal to that of one sin.

Verses 161

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

"Say, "Indeed, my Lord has guided me to a straight path–a correct religion – the way of Abraham, inclining towardtruth. And he was not among those who associated others with Allah."

In this verse Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* to proclaim to the disbelievers that he has not taken this Straight Path (the path of Allah *SWT*) under ancestral customs or some other personal reasons. Instead this is the 'way' to which he has been directed by Allah *(SWT)* Himself. This is the true religion established on firm grounds which has also been the religion of all the previous Prophets *(AS)*, including Prophet Abraham *(AS)*, who always abstained from worshipping anyone other than Allah *(SWT)*.

The 'Way of Abraham' is one further indication of the way of the True Religion which one is required to follow. This way could also have been designated as the way of Moses *(AS)* or of Jesus *(AS)*, but since their names have become falsely associated with Judaism and Christianity respectively, it was necessary to call it the 'Way of Abraham'. Moreover, Abraham *(AS)* was acknowledged by both the Jews and the Christians as rightly-guided and both knew, of course, that he *(AS)* lived long before either Judaism or Christianity was

born. In the same way, the polytheists of Arabia also considered Abraham *(AS)* to be rightly-guided. Despite their ignorance, they at least acknowledged Prophet Abraham *(AS)* as a righteous man, who had rebuilt the Ka'bah and was a worshipper of Allah *(SWT)* exclusively and no idolater.

Verses 162

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ

"Say, "Indeed, my prayer, my rites of sacrifice, my living and my dying are for Allah, Lord of the worlds".

This verse alludes to the logical outcome of perfect faith and sincerity towards Allah *(SWT)*, which is, that one admits that all his prayers, his sacrifices, his life and his death are all only for Him *(SWT)* Who *(SWT)* is the Lord *(SWT)* of the Worlds and Who *(SWT)* has no associate or partner.

It must be noted that the Arabic word 'nusuk' used in this verse signifies ritual sacrifice as well as the other forms of devotion and worship.

Verses 163

لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

"No partner has He. And this I have been commanded, and I am the first [among you] of the Muslims."

Continuing with the theme in the previous verse, this verse commands the Holy Prophet *(SAAW)* to declare to the people (believers and disbelievers alike) that Allah *(SWT)* has no associate or partner, and that whatever he *(SAAW)* is declaring has been decreed by Allah *(SWT)*. The Holy Prophet *(SAAW)* is also directed to declare to people (believers and disbelievers alike) that he *(SAAW)* is the first of Muslims (followers of Islam) from his *(SAAW)* Ummah, because the first believer from every Ummah is the Prophet *(AS)* sent to that Ummah himself *(AS)*.

Verses 164

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ

ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾

"Say, "Is it other than Allah I should desire as a lord while He is the Lord of all things? And every soul earns not [blame] except against itself, and no bearer of burdens will bear the burden of another. Then to your Lord is yourreturn and He will inform you concerning that over which you used to differ."

In this verse Allah *(SWT)* instructs His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* to ask the disbelievers and idolaters that do they want him *(SAAW)* to be like them who seek help and protection from deities other than Allah *(SWT),* even though it is He *(SWT)* Who *(SWT)* has created all things and hence there can be no other god except Allah *(SWT)* by that reason alone.

Since Allah *(SWT)* is the Lord *(SWT)* of the entire universe, how could anyone be His *(SWT)* lord? Since the entire universe is yoked to obedience to Allah *(SWT),* man is an integral part of the universe, how can he reasonably, look for another lord in that area of his life in which he uses his own volition and judgement? Is it appropriate for him to move in diametrical opposition to the entire universe?

The verse then proceeds to declare that the sins of a person will be written against his record of deeds only and it will be he who will bear the brunt and get the punishment for his transgressions in the Hereafter. The verse also elucidates that when every soul is brought in the presence of Allah *(SWT)* on the Day of Judgement then Allah *(SWT)* will surely inform every single being of his deeds and He *(SWT)* will deliver His *(SWT)* verdict regarding the differences in faith among the believers and the disbelievers. Of course, it is implied that the believers will succeed on that day, while the disbelievers will fail miserably and suffer the eternal consequences.

Verses 165

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٥﴾

"And it is He who has made you successors upon the earth and has raised some of you above others in degrees [of rank] that He may try

you through what He has given you. Indeed, your Lord is swift in penalty; but indeed, He is Forgiving and Merciful.'

The last verse of Surah al-An'am commences by elucidating that Allah *(SWT)* has made generations of people coming after generations, replacing each other on the earth as the inheritors.

The verse also expounds that Allah *(SWT)* has positioned different ranks and degrees amongst His *(SWT)* servants in terms of authority and wealth by making one poor while the other rich, one lacking in one way while the other superfluous in another, in order to test them in this worldly life whether they show gratitude and obedience or ingratitude and disobedience towards Him *(SWT)*.

The verse then decrees that Allah *(SWT)* is very swift in taking account of those who disbelieve in Him *(SWT)* while He *(SWT)* is Forgiving and Merciful for His *(SWT)* believing servants.

In a nutshell this verse illuminates three important truths:

First, that human beings as such are vicegerents of Allah *(SWT)* on earth, because Allah *(SWT)* has entrusted them with many things and endowed them with the power to use them.

Second, it is Allah *(SWT)* Himself *(SWT)* Who *(SWT)* has created different ranks among His *(SWT)* vicegerents. The trust placed in some is more than that of others. Some men have been granted control of more resources than others. Some are more gifted in respect of their abilities. Likewise, some human beings have been placed under the trust of others.

Third, all this is indeed designed to test man. The entire life of man is in fact, a vast examination wherein man is being tested about the trust he has received from Allah *(SWT)*: how sensitive he is to that trust, to what extent he lives up to it, and to what extent he proves to be competent with it. What position man will be able to attain in the Hereafter, in terms of eternal success or eternal failure depends on the result of this test.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

Note: *End of the exposition of Surah 6, Al-An'am.*

(All praise is due to Allah *(SWT)* alone!)

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل

اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'

اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانئ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

(جدید نظرثانی شدہ ایڈیشن)

❁ صفحات: 360 ❁ قیمت اشاعت خاص: 500 روپے اشاعت عام: 300 روپے

❁❁❁

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

❁ صفحات: 64 ❁ قیمت اشاعت خاص: 50 روپے ❁ اشاعت عام: 30 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

Quarterly
Oct - Dec 2020
HIKMAT-E-QURAN
Lahore
Vol. 39 No. 4

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ